جنوری 2022ء

ماہنامہ انٹرنیشنل لاہور لندن

ایڈیٹر
منزہ خان

سرپرست اعلیٰ
وچیف ایڈیٹر
محی الدین عباسی

بیک وقت "انگریزی" اور "اُردو" زبان میں لندن سے شائع ہونے والا جریدہ

ماہانہ لاہور انٹرنیشنل: ادبی، سیاسی، سماجی ومذہبی سرگرمیوں کا ترجمان

www.lahoreinternational.com

صفحہ نمبر 7

www.YouTube.com/lahoreinternational

Your favourite Monthly Magazine

Lahore International is relaunching its YouTube Channel

Subscribe now for great content!!

Where we go deep into the streets of Pakistan to bring you exclusive enjoyable content.

Head over to YouTube and check it out

DANISH HOMES.ca

THE # 1 RESOURCE TO SELL & BUY PROPERTY

647 400 1700

Canada's

PREMIUM HOME SELLING SYSTEM

WE OFFER:

1 - Priority Access to buy a Pre-Construction Condo or House anywhere in Canada
2 - Deal with all top Lenders of Canada to arrange Financing
3 - Property Management and Lease arrangement
4 - Arrangement of Legal advise to buy or sell Property
5 - Construction and Development of Your Dream Home

DANISH CHAUDHRY

Direct: 647 400 1700 / Team: 647 723 9900

هُوالـــــــــــناصر

خدا تعالیٰ کے فضل و رحم کے ساتھ

بعد از خدا بعشقِ محمدؐ مخمرم گر کفر ایں بود بخدا سخت کافرم

ماہنامہ انٹرنیشنل

لاہور لندن

علمی، ادبی، سیاسی، معاشی، معاشرتی و مذہبی سرگرمیوں کا عالمی مجلّہ

جلد نمبر: 7 شمارہ نمبر: 01 جمادی الاوّل/جمادی الثانی 1443 جنوری 2022

زیر انتظام
عباسی اکیڈمی

ایڈیٹر
منزہ خان

سرپرست اعلیٰ و چیف ایڈیٹر
محی الدین عباسی

انچارج گوشہ ادب
مدثرہ عباسی

ہمارے نمائندگان

سید مبارک احمد شاہ (ناروے)

ابن الامین (برطانیہ)

ظہیرالدین عباسی (جرمنی)

بلال طاہر (کراچی، پاکستان)

محمد سلطان قریشی (کینیڈا)

محمد عرفان (بیورو چیف سینٹرل پنجاب)

بدر الدین کلھوڑو (بیورو چیف سندھ پاکستان)

چوہدری مقبول احمد (بھارت)

انس احمد (بیورو چیف لاہور)

اس شمارہ میں

درس قرآن کریم 4
اداریہ 5
بنگلہ دیش کے قیام کے پچاس برس 8
بیگم وقار النساء 12
عقلمند لوگو! معیشت ہی میں راہ نجات ہے 15
بے دماغ اور بد دماغ سیاست 17
بارود بھرے لوگ 18
عدلیہ کا حصہ بننے کی بجائے چوپایہ پالتیں اور اپلے تھوپتی 20
ایک آرائیں کی کہانی زمانے کی زبانی 21
دنیا کی سب سے طاقتور دوربین خلا میں جانے کے لیے تیار 22
یادیں ثاقب زیروی 23
ارے نالائق تم مسجد میں نیکر پہن کر کیوں آگئے 24
14 منزلہ کروز شپ کو... تفریح کا ذریعہ بنانے کی امیدیں دم توڑ گئیں 25
حکومت طلباء اور تعلیم سے لاتعلق ہو چکی ہے 26
ذیابطیس کے مریض اومیکرون سے کیسے بچ سکتے ہیں 27
کیا فزکس خدا کے وجود کو ثابت کر سکتی ہے 28
چشمہ لگانے والے افراد کے لیے اچھی خبر 30
انسولین کے سو سال اور ہمارا حال 31
چین میں انڈے سے نکلنے کو تیار ڈائنوسار کا فوسل دریافت 32
امریکا کا سب سے زیادہ آسیب زدہ ہوٹل 33
پراگ گروال 35
دنیا کا سب سے بڑا نیلم نمائش کیلئے پیش 36
فانس سے فانوس بننے کا سفر شفاف شیشے کے طفیل 37
افغانستان میں... والدین اپنی بچیاں فروخت کرنے پر مجبور 38
سعودی عرب کی اولین گراں پری اور جسٹن بیبر کی پرفارمنس 39
نہرو کی اہمیت 40
کوانٹم کمپیوٹنگ 41
طلاق کے لیے 55 کروڑ پاؤنڈ کا سمجھوتا 43
چھٹی قومی اہل قلم کانفرنس 2021 44
عرب خطے کا سب سے بڑا چرچ عوام کے لیے کھول دیا گیا 45
امروہے والے ماموں اور کراچی والے چاچا 46
ترکی بہ ترکی کا محاورہ ایران میں رائج نہیں 47
حبیب جالب ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم 48
امتحان میں پاس ہونے کی سفارش 50
ہاسٹل میں پڑھنا 51
مجاز ایک گمشدہ حقیقت 56
شعر و شاعری 7-24-25 34-55

قیمت فی شمارہ: 3 پاؤنڈ

ADVERTISEMENT TARIFF
(Effective : January 01, 2018)

	Monthly	Quarterly	Half Year	Yearly
Full Page	150	420	800	1530
Half Page	90	250	540	920
Quarter	50	140	270	510

(Price in UK Pound Currency)

website : lahoreinternational.com

اپنی تحریریں اور قیمتی آراء درج ذیل ای میل پر بھجوائیں:

lahoreintlondon@gmail.com
m.abbasi.uk@gmail.com

ماہنامہ لاہور میگزین انٹرنیشنل آپ کا اپنا رسالہ ہے
اس کی اشاعت و ترویج میں بھرپور حصہ ڈالیئے۔

درس قرآن کریم

وَ الضُّحٰی وَ الَّیۡلِ اِذَا سَجٰی مَا وَدَّعَکَ رَبُّکَ وَ مَا قَلٰی وَ لَلۡاٰخِرَۃُ خَیۡرٌ لَّکَ مِنَ الۡاُوۡلٰی وَلَسَوۡفَ یُعۡطِیۡکَ رَبُّکَ فَتَرۡضٰی اَلَمۡ یَجِدۡکَ یَتِیۡمًا فَاٰوٰی وَوَجَدَکَ ضَآلًّا فَهَدٰی

(سورۃ الضحیٰ آیت 2 تا 8)

ترجمہ:

مَیں دن کوشہادت کے طور پر پیش کرتا ہوں' جب وہ روشن 1 ہوجائے۔ اور رات کو (شہادت کے طور پر پیش کرتا ہوں) جب اس کی تاریکی چاروں طرف 2 پھیل جائے۔ کہ نہ تیرے رب نے تجھے ترک کیا 3 ہے اور نہ تجھ سے ناراض ہوا ہے۔ اور (دیکھ تو سہی کہ) تیری ہر پیچھے آنے والی گھڑی پہلی سے بہتر 4 ہوتی ہے۔ اور ضرور تیرا رب تجھے (وہ کچھ دے کر رہے گا جس پر تو خوش ہوجائے 5 گا۔ کیا (اس زندگی میں اس کا سلوک تیرے ساتھ غیر معمولی نہیں رہا اور) اس نے تجھے یتیم پاکر (اپنے زیرِ سایہ) جگہ نہیں دی۔ اور (جب) اس نے تجھے (اپنی قوم کی محبت میں) سرشار 6 دیکھا تو (ان کی اصلاح کا) صحیح راستہ تجھے بتادیا۔

تفسیر:

1) یعنی جب بھی اسلام کو ترقی حاصل ہوگی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت ظاہر ہوجائے گی۔ (2) یعنی جب بھی دین میں ایک لمبی کمزوری پیدا ہوگی۔ یہ ثابت ہوجائے گا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نور میں کچھ رکاوٹیں پیدا ہوگئی ہیں اور اس لئے دنیا ان کے نور سے متمتع نہیں ہورہی۔ (3) اس میں بتایا گیا ہے کہ دنیا میں تاریکی کا آنا اس بات کا ثبوت نہیں ہوگا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جھوٹے ہیں بلکہ اس بات کا ثبوت ہوگا کہ انسان خراب ہوگیا ہے اور اس کی اصلاح کے لئے نیا سورج طلوع ہونے والا ہے جو پھر سے اسلام کو غالب کردے گا۔ (4) یعنی جب بھی دنیا میں کوئی خرابی پیدا ہوتی ہے اللہ تعالیٰ تیری تائید کرنے والے آدمی کھڑے کردیتا ہے اور قیامت تک کھڑے کرتا رہے گا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہوگا کہ تو سچا ہے۔ (5) مطلب یہ ہے کہ جب آخر تک تجھے کامیابی ہی ملتی جائے گی تو تیری خوشی میں کیا شبہ ہے۔ (6) یہاں ضَآلًّ کا لفظ ہے۔ مفسروں نے لکھا ہے کہ اس کے یہ معنے ہیں کہ تو گمراہ تھا ہم نے تجھے ہدایت دی۔ مگر لغت میں ضَلِّ کے معنے محبت میں سرشار ہونے کے بھی ہیں (دیکھئے مفرداتِ راغب) اور یہی معنے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کے مطابق ہیں یعنی اے رسول! تُو اپنی قوم کی ہدایت کی خواہش میں سرشار تھا سو ہم نے تجھے وہ راستہ بتادیا جس سے تُو قوم کی اصلاح کرسکے۔

حدیث:

حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عنقریب ایسا زمانہ آئے گا کہ نام کے سوا اسلام کا کچھ باقی نہ رہے گا۔ الفاظ کے سوا قرآن کا کچھ باقی نہیں رہے گا۔ اس زمانہ کی مسجدیں بظاہر آباد تو نظر آئیں گی لیکن ہدایت سے خالی ہوں گی ان میں سے ہی فتنے اٹھیں گے اور ان میں ہی لوٹ کر جائیں گے یعنی تمام خرابیوں کا وہی سرچشمہ ہوں گے۔

(مشکوٰۃ کتاب العلم الفصل الثالث صفحہ 38، کنز العمال صفحہ 43/6)

حضرت عبد اللہ بن عمروؓ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری اُمت پر بھی وہ حالات آئیں گے جو بنی اسرائیل پر آئے تھے جن میں ایسی مطابقت ہوگی جیسے ایک پاؤں کے جوتے کی دوسرے پاؤں کے جوتے سے ہوتی ہے یہاں تک کہ اگر ان میں سے کوئی بدبخت اپنی ماں سے بدکاری کا مرتکب ہوا تو میری امت میں سے بھی کوئی ایسا بدبخت نکل آئے گا۔ بنی اسرائیل 72 فرقوں میں بٹ گئے تھے اور میری اُمت 73 فرقوں میں بٹ جائے گی۔ لیکن ایک فرقے کے سوا باقی سب جہنم میں جائیں گے۔ صحابہ نے پوچھا یہ ناجی فرقہ کون سا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ وہ فرقہ جو میری اور میرے صحابہ کی سنت پر عمل پیرا ہوگا۔

(ترمذی کتاب الایمان باب افتراق ھذہ الامۃ صفحہ 89/2 جامع الصغیر صفحہ 110/2 مصری)

(ابن ماجہ کتاب الفتن باب افتراق الامم صفحہ 287)

حضرت ابوسعید خدریؓ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم لوگ اپنے سے پہلی اقوام کے طور طریقوں کی اس طرح پیروی کروگے کہ سرمو فرق نہ ہوگا اس طرح جس طرح ایک بالشت دوسری بالشت کی طرح اور ایک ہاتھ دوسرے ہاتھوں کی طرح ہوتا ہے اور ان میں کوئی فرق نہیں ہوتا یہاں تک کہ اگر بالفرض وہ کسی گوہ کے سوراخ میں داخل ہوں گے تو تم بھی ان کی پیروی کروگے۔ ہم نے کہا یارسول اللہ کیا آپ کی مراد یہود اور نصاریٰ سے ہے فرمایا اور کون؟

(بخاری کتاب الاعتصام والسنۃ باب قول النبی لتتبعن من کان قبلکم)

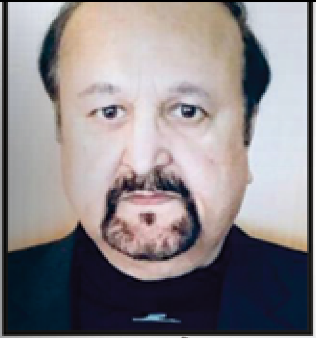

اداریہ

جمہوریت اور آمریت

دونوں قوم کے مجرم

مدیر اعلیٰ - محی الدین عباسی

سورہ سباکی آیت 3 مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ یہ آیت ہمیں سمجھاتی ہے کہ جیسا کرو گے ویسا پاؤ گے۔ جو بیجو گے وہی نکلے گا۔ نیک اعمال کا نتیجہ نیک اور بد کا بد انجام۔ پاکستان بننے کے بعد سے اب تک دونوں اداروں کے درمیان اقتدار کی ہمیشہ کشمکش جاری ہے۔ کبھی ہم جمہوریت کو اقتدار میں دیکھتے ہیں تو کبھی آمریت کو۔ اب عوام میں یہ شعور پیدا ہو گیا ہے کہ وہ ان دونوں کی سیاست کو سمجھنے لگے ہیں۔ یہ ایک دوسرے کی لائف پالیسی ہیں اور پارٹنر ہیں۔ اس ضمن میں اس کا موازنہ کرتے ہیں حالات اور واقعات کی روشنی میں جو درج ذیل ہے:

ملک کے 4 اہم ستون ہیں: ریاست، عدلیہ، میڈیا اور فوج

دنیا کے کسی ملک میں ان کا مضبوط ہونا نہایت ضروری ہے تبھی وہ عوام کو خوشحال اور ملک کو تُرقی دے سکتے ہیں۔ بدقسمتی سے یہ تمام ادارے زوال پذیر ہیں معاشرہ میں یہ اپنی اہمیت کھو چکے ہیں جس کی بنیادی وجہ ان میں پائی جانے والی انتہائی کرپشن ہے۔

جہاں تک پرنٹ اور الیکٹرنکس میڈیا کا تعلق ہے اس انڈسٹری میں 90 فی صد صحافی و انیکر پرسن قومی مفاد، ملکی سلامتی اور عوام کی بھلائی کے لئے تعمیری کردار ادا نہیں کر رہے۔ ہم ایک لفافہ کے محتاج ہیں جو اپنے ضمیر کا سودا کر لیتے ہیں۔ برنس ٹائی کُون ملک ریاض نے ان کو خریدا ہوا ہے جس طرح وہ چاہے ان دونوں جمہوریت اور آمریت کے حق میں کچھ بھی کروا سکتا ہے۔ ملک ریاض تو اتنا بااَثر شخص ہے جو ان تمام چاروں ستون پر حاوی ہے حکومت کو قائم کرنے اور ختم کرنے میں اس کا جادو چلتا ہے اور کسی پاکستانی عدالت نے اس کو آج تک سزا نہیں دی جبکہ برطانیہ کی عدالت نے اس کے خلاف فیصلہ دیا اور برطانیہ میں اس کی جائیداد اور رقم کو پاکستان کے حوالے کر دیا اور اب یہ برطانیہ بھی نہیں جا سکتا۔

پاکستانی عدلیہ عالمی رینکنگ میں 128 ممالک کی درجہ بندی میں آزاد شفاف انصاف پر مبنی فیصلہ کرنے میں 118ویں نمبر پر ہے پہلے نمبر پر کافر ملک بیلجئم کے جج آئے جو جہنم میں جائیں گے بقول ملّاؤں کے 118ویں نمبر پر آنے والے ہمارے ججز فرشتے ہیں جو جنت میں جائیں گے۔ دوسری عالمی جنگ کے موقع پر برطانیہ کے سابق وزیر اعظم چرچل نے کہا تھا اگر ہماری عدالتیں صحیح فیصلہ کر رہی ہیں تب ہم جنگ ہار نہیں سکتے۔ یہ ہے کسی ملک کے انصاف کرنے والوں کا بنیادی نکتہ نظر۔ لیکن ہم تو اسلامی مملکت اور مسلمان ہیں ہم اسلامی تعلیمات و سُنت پر عمل نہیں کرتے اور خدا کا خوف ان کے دل میں کیوں نہیں اُٹھتا۔

خدا تعالیٰ قرآن کریم میں ارشاد فرماتا ہے۔ ترجمہ: اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ کی خاطر مضبوطی سے نگرانی کرتے ہوئے انصاف کی تائید میں گواہ بن جاؤ اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں ہر گز اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف نہ کرو۔ انصاف کرو یہ تقویٰ کے سب سے زیادہ قریب ہے اور اللہ سے ڈرو یقیناً اللہ اس سے ہمیشہ باخبر رہتا ہے جو تم کرتے ہو۔ (سورۃ المائدہ آیت 9)

دوسری آیت میں فرمایا کہ انصاف کو مضبوطی سے قائم کرنے والے بن جاؤ خواہ خود اپنے خلاف گواہی دینی پڑے۔ والدین اور قریبی رشتہ داروں کے خلاف گواہی دینی پڑے۔ (سورۃ النساء آیت 136)

یاد رکھیں جب کسی قوم میں بد عملی، بد خلقی اور ناانصافی اجتماعی طور پر آجائے تو تباہی و بربادی اس کا مقدر بن جاتی ہے اور وہ زوال پذیر ہو جاتی ہے۔ جب ہم حیاتِ انسانی کے ارتقاء پر نظر ڈالیں تو ہمیں اس کا رُخ اجتماعیت کی طرف ہی نظر آتا ہے اور جب فطرت کے خلاف چلیں، قانون قدرت کو بُھلا دیں، نافرمانی و گستاخی کریں تو خدا تعالیٰ کی پکڑ میں آجاتے ہیں۔ قومیں اجتماعی طور پر بد عمل ہو جائیں تو اس کی سزا دنیا میں ہی مل جاتی ہے۔ اس ضمن میں قرآن کریم میں مختلف قوموں کی تباہی کا ذکر ہے۔ پاکستان کے ان چاروں ستونوں میں یہ برائیاں کثرت سے پائی جاتی ہیں اور پھر یہ خدا اور رسول کی باتوں کو پسِ پشت جان بوجھ کر ڈال دیتے ہیں۔ یاد رہے اللہ تعالیٰ کا قانون مکافاتِ عمل اور کڑا احتساب ہے جو ہر شخص کو مرنے سے پہلے روئے زمین پر دنیا میں دینا ہو گا۔ آیئے اب ہم ماضی کے جُھروکوں میں جھانک کر دیکھتے ہیں۔ جمہوریت اور آمریت پاکستان بننے سے آج تک ان دونوں اہم ستون کے درمیان کس قسم کے تعلقات قائم رہے ہیں۔

جنرل ایوب خان پہلے مقامی کمانڈر انچیف تھے اُس وقت مدت ملازمت 4 سال ہوا کرتی تھی۔ بوگرہ حکومت کے گھر جانے کے بعد ایوب خان کو 1955ء میں بطور کمانڈر انچیف 4 سال کی مزید توسیع ملی حالانکہ جنرل ایوب نے گورنر جنرل سکندر مرزا کو برطرف کر کے اقتدار پر قبضہ کیا۔ پھر جون 1958ء میں دوسری توسیعی مدت ختم ہونے میں ایک سال باقی تھا انہیں صدر سکندر مرزا کے دباؤ پر فیروز خان نون حکومت سے مزید دو برس کی توسیع مل گئی۔ حالانکہ فیروز خان نون حکومت اگلا کمانڈر انچیف میجر جنرل نواب زادہ جنرل شیر علی خان کو دیکھ رہے تھے۔ بقول الطاف گوہر کمانڈر انچیف ایوب خان کو یہ گوارا نہ تھا۔ دراصل اس وقت سکندر مرزا اور ایوب خان کی گہری دوستی تھی پھر ایک وقت ایسا آیا اقتدار کے نشے میں ایوب خان نے سکندر مرزا کو ایک رات نیند سے اُٹھا کر 27/اکتوبر 1958ء کو بطور صدر ان سے استعفیٰ لے کر خود صدر بن گئے۔ 18 ستمبر 1966ء کو جنرل یحییٰ خان اس عہدہ پر فائز ہوئے اُس وقت جمہوریت اور آمریت آمنے سامنے جنگ کی صورت میں کھڑی ہو گی اس دوران ملک میں ہنگامے اور افراتفری رہی۔ ذوالفقار علی بھٹو صاحب اس میں پیش پیش رہے اور نئے الیکشن کروانے کے لیے تمام سیاسی جماعتوں نے عوام کو بیدار کیا۔ جس پر ایوب خان کی اقتدار پر گرفت کمزور ہوتی گئی یہ دیکھ کر یحییٰ خان نے 31 مارچ 1969ء کو انہیں گھر بھیج کر خود اقتدار پر براجمان ہو گئے۔ 1971ء میں پاکستان میں بالغ رائے دہی کی بنیاد پر ہونے والے پہلے انتخابات کے تقریباً ایک سال بعد ہی ملک کو جنگ کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ قومی انتخابی نتائج جمہوری تقاضوں کو پورا نہیں سکی۔ 25، 26 مارچ 1971ء کی درمیانی شب ڈھاکہ میں خوفناک فوجی کریک ڈاؤن ہوا جو مشرقی پاکستان میں خانہ جنگی کا آغاز ثابت ہوا۔ اس دوران لاکھوں بنگالی، ہندوسرحد پار بھارت چلے گئے اس کے بعد مکتی باہنی کی حمایت میں بھارت نے مشرقی پاکستان پر حملہ کیا پھر ملک دولخت ہو گیا۔ اس میں اہم رُول

بھارت نے ادا کیا۔ امریکی حکومت اس میں بھی شامل تھی جس نے مدد نہ کی۔ اس وقت ہمارے چین سے اچھے تعلقات تھے وہ بھی مدد نہ کرسکا اس طرح یہ جنگ دو ہفتوں میں ہی ختم ہوگئی۔ اس پر عالمی طاقتوں نے مذمت اور ہمدردی کے سوا کچھ نہ کیا۔

دیکھا جائے تو دسمبر 1971ء کے انتخابی نتائج میں پارٹی پوزیشن نے ہی ملک کو تقسیم کر دیا تھا۔ اس کے بعد کے سارے فوجی اور سیاسی عمل ایک ہاری ہوئی جنگ کو جیتنے کی ناکام کوششیں تھیں اس عمل میں الیکشن کمیشن نے غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کیا۔ راقم اس کو قصوروار تسلیم کرتا ہے دوسرے قصوروار ہمارے پاکستانی جمہوری لیڈرز تھے۔

مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے الیکشن جو 7 دسمبر 1971ء میں ہوئے اس میں عوامی لیگ پارٹی کے شیخ مجیب الرحمٰن نے سب سے زیادہ ووٹ حاصل کئے۔ 300 انتخابی حلقوں میں سے 162 مشرقی پاکستان اور 138 مغربی پاکستان میں تھے۔ اس میں عوامی مسلم لیگ نے 160 نشستیں اور مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی نے 81 نشستیں حاصل کیں۔

بھٹو نے سندھ اور پنجاب سے یہ سیٹیں جیتیں تھیں۔ دوسرے صوبوں سے دیگر جماعتوں نے ایوان زیریں کی کل 300 نشستیں اس میں اکثریت کے لئے 151 نشستیں درکار تھیں اور اس کا ٹرن آؤٹ 63 فیصد رہا۔ ہماری جمہوریت کی بدقسمتی یہ تھی کہ بھٹو صاحب نے اس کو قبول نہ کیا یعنی عوامی رائے کو۔ حسن ظہیر اپنی کتاب (Seperating of East Pakistan) میں لکھتے ہیں یحییٰ خان کو معلوم ہو گیا تھا کہ انہیں مغربی پاکستانی سیاستدانوں کی مکمل حمایت حاصل ہے اور وہ ان کے ذریعے ملک میں ایک ایسا آئین کا نفاذ چاہتے ہیں جو بنگالیوں کے مطالبات کا واحد توڑ ہو سکتا تھا۔ جسٹس کار نیلیئس نے بڑی محنت سے یہ آئین بھی تشکیل دے دیا تھا۔ اس ضمن میں تمام کوششیں رائیگاں گئیں۔ اس کا انجام پیپلز پارٹی کے لیڈر ذوالفقار علی بھٹو کے نعرہ نے سب کچھ ختم کر دیا نعرہ یہ تھا ''اُدھر تم' اِدھر ہم'' یہ خبر لاہور کے اخبار ''آزاد'' نے شہ سرخی سے شائع کی۔ آج ہم کن کن کو مُردِ الزام ٹھہرائیں۔ لہٰذا پہلی بار جمہوریت نے آپس میں دست و گریبان ہو کر آئندہ کے لئے اس کھیل کو جاری رکھنے کا بیج بُو دیا جو اب تک جاری و ساری ہے۔ اس کے بعد بھٹو صاحب کو 23 دسمبر 1971ء کو صدر اور سول مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر کر دیا گیا۔ بھٹو صاحب ڈھائی سال تک اس عہدہ سے چمٹے رہے اور اس طرح فوجی اقتدار کے مزے بھی لیتے رہے۔

بھٹو صاحب جب وزیر اعظم بنے، ملک کا پہلا جمہوری آئین قومی اسمبلی کے ذریعہ 1973ء کو دیا۔ اس آئین میں جمہوریت نے فوجی حکمرانوں کا راستہ روکنے کے لئے آئین میں ''آرٹیکل 6'' کا اضافہ کیا اس کا مطلب آئین سے کھیلنے والا سنگین غداری کا مرتکب سمجھا جائے گا اور موت یا عمر قید کی سزا پائے گا۔

اس نفاذ کے 4 سال بعد جنرل ضیاء الحق نے بھٹو کی حکومت کو برطرف کرتے ہوئے مارشل لاء نافذ کر دیا۔ دوسری طرف عدالت عظمیٰ نے اس بغاوت یا غداری کو ''نظریہ ضرورت'' قرار دیا۔ اس سے قبل پہلی بار جسٹس منیر احمد نے اس کی داغ بیل ڈالی تھی۔ اس کے بعد جنرل ضیاء الحق نے اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے 9 دسمبر 1984ء کو ریفرینڈم کروایا۔ جس میں رائے دہندگان سے سوال پوچھا گیا کہ ''کیا آپ صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق کی جانب سے پاکستان کے قوانین کو قرآن و سنت کے مطابق ڈھالنے نظریۂ پاکستان کے تحفظ اور استحکام کے لئے جانے والے اقدامات کو جاری رکھنے اور عوام کے منتخب نمائندوں کو اقتدار کی پُرامن اور منظم تبدیلی کی حمایت کرتے ہیں۔'' عوام کو اس سوال کا جواب ہاں یا نہ میں دینا تھا۔ ہاں کا مطلب یہ تھا کہ جنرل ضیاء الحق کو آئندہ 5 سالوں کے لئے صدر منتخب کرنا اس طرح یہ 9 سالوں تک اقتدار میں رہے۔ ڈاکٹر عائشہ جلال اپنی کتاب ''دی سٹرگل فار پاکستان'' میں لکھتی ہیں کہ خیبر سے کراچی تک عوام نے اس ریفرینڈم کا بائیکاٹ کیا جس نے جمہوریت کے لئے قومی سطح پر ایک اتفاق رائے کو ظاہر کیا۔ ایک اندازہ کے مطابق ووٹنگ کی شرح 10 فی صد سے زیادہ نہ تھی اور اس میں زبردست دھاندلی کی گئی جبکہ زمینی حقائق یہ تھے۔ لیکن الیکشن کمیشن نے اس کو 62 فی صد کہا اور اس میں 97 فی صد سے زیادہ لوگوں نے ''ہاں'' کا ووٹ دیا۔ یاد رہے تمام سیاسی جماعتوں نے اس کا بائیکاٹ کیا تھا۔ غیر جماعتی انتخابات کے نتیجے میں نئی اسمبلی وجود میں آئی اس کے وزیر اعظم محمد خان جونیجو منتخب ہوئے۔ بعدہٗ اس کی حکومت کو بھی چلتا کر دیا گیا۔ ضیاء الحق کے دورِ اقتدار میں اسلام کے نعرہ نے اسلام کو بہت کمزور کیا چونکہ اس آمر مطلق العنان شخص نے اپنے اقتدار کی خاطر کئی صدارتی آرڈیننس نافذ کئے جس سے دنیا میں اسلام کا امیج غلط رنگ میں پیش ہوا۔ اس میں ایک بدنام زمانہ امتناع قادنیت آرڈیننس 1984ء تھا اس میں جنرل ضیاء الحق نے اپنی غیر قانونی حکومت کو سہارا دینے کے لئے مذہبی انتہاپسندوں کا سہارا لیا۔ خود کو امیر المومنین بنانے کی تیاری بھی کی۔

مدینہ کا واقعہ ہے بنونضیر کی جلاوطنی کے وقت مسلمانوں کے دل میں یہ معمولی سا خیال پیدا ہوا کہ وہ اپنے بچوں کو جبراً بنونضیر سے واپس لے لیں تو ''لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْن'' کی آیت نازل ہوئی جبکہ اِکْرَاہَ کا مسئلہ دین سے زیادہ سیاست سے تعلق رکھتا ہے کیونکہ ایمان تو دلیل اور برہان سے پیدا ہوتا ہے کسی قسم کے اکراہ سے پیدا نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں اس میں کوئی شک نہیں بھٹو صاحب ایک زیرک اور ذہین سیاستدان تھے لیکن وہ بھی مذہبی انتہاپسندوں کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک غلط فیصلہ کر بیٹھے جس کی قرآن و سُنت اجازت نہیں دیتا یعنی اسمبلی سے احمدیوں کو غیر مسلم قرار دلوایا۔ جب کہ وہ ایک سیکولر انسان تھے دین کے معاملہ میں ان کو کچھ علم نہ تھا اس غلطی کا اعتراف انہوں نے بھی کیا اور ان کے قریبی سینئر ترین ساتھیوں نے بھی۔ ڈاکٹر مبشر حسن ان کے بھائی مہدی حسن اور عبدالحفیظ پیرزادہ اپنے انٹرویو میں برملا اس کا اظہار کر چکے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ یہ احمدیوں کو غیر مسلم قرار دینا یہ ایک سیاسی فیصلہ تھا مذہبی نہیں۔ بہرحال آمروں اور جمہوری لیڈروں نے ماضی کی غلطیوں سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا۔ قانونِ فطرت ہے جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔ 12/اکتوبر 1999ء کو جنرل پرویز مشرف نے نظام جمہوریت کی بساط اُلٹ دی تو عدالت عظمیٰ نے اس کو نظریہ ضرورت قرار دیا۔ بعدہ 2002ء میں عوام کی عدالت یعنی قومی اسمبلی نے اس کو جائز قرار دیتے ہوئے اس کی توثیق کر ڈالی پھر 8 سال بعد نظر ثانی کی اپیل نواز شریف کے ذریعہ منظور ہوئی۔ لہٰذا یہ معاملہ یہاں دونوں پارٹی کی پسند ناپسند پر سمجھا جائے گا درمیان کے حالات کا آپ کو بخوبی علم ہے کس طرح ملک میں لنگڑی لُولی حکومت قائم رہی اسی دور میں نائن الیون ہوا پھر ہم مکمل طور پر امریکہ کے مفادات کے تقاضے پورے کرتے رہے اور ملک میں سول اور فوجی افراد ہزاروں کی تعداد میں شہید ہوئے اور پاکستان کو اربوں کھربوں کا مالی نقصان ہوا علاوہ ملک میں انتشار خلفشار دہشت گردی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

3 نومبر 2007ء کو ملک میں ایمرجنسی نافذ ہوئی تو عدالت عظمیٰ کے ایک 7 رُکنی بینچ نے اس اقدام کو خلاف آئین قرار دیا۔ یاد رہے یہ وہی آرٹیکل 6 ہے جس میں بھٹو صاحب نے جمہوریت میں آمروں کا راستہ روکنے کے لئے آئین میں ترمیم کی تھی اس کی خلاف ورزی پر مجرم کو غدار قرار دینا اور موت یا عمر قید کی سزا دی گئی ہے۔

اس کے بعد 2008ء میں ملک میں نئے الیکشن کے ذریعہ قومی اسمبلی تشکیل پائی اُس وقت آصف علی زرداری نے نواز شریف سے مشورہ کیا کہ 3 نومبر 2007ء والے اقدام کو سند جواز عطا کر دی جائے جس پر نواز شریف نہ مانے یہ معاملہ درمیان میں اٹک گیا۔ پھر

31 جولائی 2009ء کے فیصلے کی رُو سے سپریم کورٹ نے 3 نومبر 2007ء کو خلافِ آئین قانون قرار دے دیا یعنی (ایمرجنسی) اور اپنے فیصلے میں لکھا کہ چونکہ اُس وقت صدر رفیق تاڑر نے استعفیٰ نہیں دیا تھا اس لئے آئین کو توڑنا قرار دیا۔ علاوہ ازیں وفاقی حکومت کی ہدایت یا حکم کے بغیر فوج از خود اقدام نہیں کرسکتی۔ پہلے آصف علی زرداری نے نواز شریف کو مشورہ دیا تھا اُس وقت وہ تیار نہ ہوئے بعد میں اُنہوں نے نعرہ لگایا ''آگے بڑھو ہم تمہارے ساتھ ہیں۔'' قارئین کرام دونوں سیاسی پارٹیوں کا سیاست کا کھیل یہاں سے شروع ہوا یعنی ''پہلی باری ہماری دوسری تمہاری'' یہ جمہوریت کا دورِ مصالحت کا تھا اس میں بیچاری عوام کا جنازہ نکلتا رہا اس طرح دونوں نے اپنی اپنی باریاں مکمل کیں یاد رہے پرویز مشرف کو رخصت کرتے وقت زرداری صاحب نے ریڈ کارپٹ کے ذریعہ ہی ان کو باعزت رخصت کیا تھا اس کے بعد پرویز مشرف کو عدالتوں میں گھسیٹا گیا غداری اور مجرم کو سزا دینے میں عدالت عظمیٰ اور جمہوریت ناکام رہی اس کے بعد نواز شریف نے باعزت باہر جانے کی ان کو اجازت دی۔

مشرف دور کے بعد دونوں جمہوری پارٹیوں نے اپنے ذاتی مفادات کو ملک پر ترجیح دی کسی نے ملک اور عوام کی ترقی کے لئے کچھ نہ سوچا، اس میں ہمارے ججز بھی مکمل طور پر شامل رہے۔ مزید یہ کہ جمہوریت کے ان لیڈروں نے اپنی من پسند شخصیات کو سیاسی طور پر استعمال کیا اور من پسند ججوں کو بھرتی کیا اور نیک، دیندار ججوں کو خوف زدہ بھی کیا۔ ان دونوں نے پاکستان کے آئین اور تمام ریاستی اداروں کو بُری طرح کرپشن سے دوچار کر دیا۔ آج کوئی ادارہ ایسا نہیں جو انصاف سے کام کرے اور عوام کی صحیح معنوں میں خدمت کرے۔ اربوں کھربوں کی ملکی دولتیں لوٹ کر بیرون ملک فرار ہیں۔ آج عدالتیں اس پر خاموش ہیں کوئی اس پر سوموٹو نوٹس نہیں لیتا حالانکہ عدالتوں میں ان کے خلاف واضح ثبوت موجود ہیں۔ انصاف کرنے والے اس ڈر اور خوف میں مبتلا ہیں کہ کل یہ اقتدار میں واپس آئے تب ہمارا کیا ہوگا۔

کوئی ملک کی بقاء، سلامتی اور عوام کی خوشحالی کو مدِنظر نہیں رکھتا جبکہ خدا تعالیٰ کا واضح پیغام ہے کہ انصاف کرو اور عدل سے کام لو ورنہ پچھلی قوموں کی طرح ان کو بھی تباہ کر دیا جائے گا۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں نصیحت کرتا ہے کہ بایں طور پر کہ جو اگلی قوموں کی بُرائیاں اور خوبیاں ہیں ان کو بیان کرنا تا کہ مسلمان اُن برائیوں سے بچیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ وہ ان عذابوں سے محفوظ رہیں گے جو اُن برائیوں کی وجہ سے ان پر نازل ہوئے اور ان خوبیوں کو اختیار کریں جن کی برکت سے ان پر طرح طرح کے انعام ہوئے۔ پس ان حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے پاکستان کے تمام ذمہ دار اداروں کا فرض ہے وہ خوفِ خدا کو مدِنظر رکھتے ہوئے سچے مومن مسلمانوں کی طرح سوچ وبچار کرتے ہوئے معاشرتی بُرائیوں، ملک کی خاطر عوام کی خوشحالی و بہتری کا سوچیں۔ اور ان دو اہم اداروں جن پر اندرونی و بیرونی سازشوں کے صدِباب کرنے کی ذمہ داریاں ہیں اس پر نیک نیتی سے عمل کریں اور اس کھیل کو بند کریں جو ملکی مفاد میں نہیں ہے یعنی حکومتوں کے خاتمہ اور اقتدار کی خاطر مذہبی تنظیموں کو استعمال کرنا۔ پھر ایسی اسلامی دہشت گرد تنظیموں کو تیار کرنا ان کو مکمل سپورٹ کرنا جو کہ ملکی مفاد میں نہیں ہیں حالیہ دنوں میں اور پچھلی حکومت کے خاطر یہ سلسلہ اپنایا گیا اس میں نا اسلام نا ہی جمہوریت نا ہی آمریت کا فائدہ ہے۔ یہ بات بھی یاد رکھیں بیرونی طاقتوں کے ذریعہ اقتدار میں آنے کا سہارا نہ لیں صرف اور صرف عوام کی خدمت کے ذریعہ ہی اقتدار میں آنے کی کوشش کریں۔ طاقت کا سرچشمہ خدا تعالیٰ کی ذات ہے دوسرا کوئی نہیں اُسی کے آگے سر بسجود ہوں وہی ہے عزت اور ذلت دینے والا اللہ کرے ہماری قوم اس پر عمل پیرا ہوں اور ماضی کے حالات سے سبق حاصل کریں۔

❁❁❁

نیا سال آ گیا

م م محمودؔ

بیتا برس اک اور نیا سال آ گیا
ہر سُو بپا ہے شور نیا سال آ گیا
پارینہ ماہ و روز کیوں تکتے ہو بے سبب
دیکھو بنظرِ غور نیا سال آ گیا
تازہ ہیں چھالے پاؤں کے، رِستے ہیں زخم ابھی
پچھلے برس کے اور نیا سال آ گیا
ڈھاتا جفا نئی ہے تُو ہر سال اے غنیم!
کر تیز تیغِ جور نیا سال آ گیا
کر لیجیے برائے خدا اب تو آنجناب
تبدیل طرز و طور نیا سال آ گیا
ایّامِ آفرین وہ عہدِ سرور و کیف
لوٹے گا کب وہ دور نیا سال آ گیا
رفتارِ عمر جاں سبک رَو ہے مثلِ برق
کر جلد فکرِ گور نیا سال آ گیا

❁❁❁

بنگلہ دیش کے قیام کے 50 برس

زبان، ثقافتی تسلط، حق تلفی یا کوئی سازش، مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بننے میں کارفرما عوامل کیا تھے؟

تحریر: عابد حسین

جب انڈین وزیر اعظم نریندر مودی نے رواں سال مارچ میں بنگلہ دیش کے قومی دن کے موقع پر ڈھاکہ کا دورہ کیا تو ہم منصب حسینہ واجد کے ہمراہ دونوں ملکوں نے اس فیصلے پر اتفاق کیا کہ وہ چھ دسمبر کو 'میتری دیواس' یعنی دوستی کا دن منائیں گے۔

اس تاریخ کی اہمیت جاننے کے لیے 50 برس پیچھے جانا ہو گا، جب چھ دسمبر 1971 کو انڈیا نے بنگلہ دیش کو اس وقت بحیثیت ایک خود مختار ملک تسلیم کر لیا تھا جب وہ پاکستان کا مشرقی حصہ تھا۔ اس کے صرف دس دن بعد مشرقی پاکستان میں پاکستانی فوج کے کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل امیر عبداللہ خان نیازی نے انڈین فوج کے لیفٹیننٹ جنرل جگجیت سنگھ اروڑا کے ساتھ ہتھیار ڈالنے کی دستاویز پر دستخط کر کے شکست تسلیم کر لی اور بنگلہ دیش باضابطہ طور پر ایک نئی ریاست کے طور پر دنیا کے نقشے پر سامنے آیا۔ یہ کہنا غلط نہیں ہو گا کہ جنوبی ایشیائی ممالک میں بنگلہ دیش کے سب سے قریبی تعلقات انڈیا سے ہیں صرف تجارتی سطح پر بات کی جائے تو دونوں ملکوں کے مابین دس ارب ڈالر کی تجارتی شراکت داری ہے جو کہ جنوبی ایشیا میں سب سے زیادہ ہے۔ پاکستان میں پڑھائی جانے والی نصابی کتب کے مطالعے سے اس ریاستی بیانیے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو بنگلہ دیش اور انڈیا کے درمیان اتنے قریبی تعلقات اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی وجوہات کا احاطہ کرتا ہے۔

مثال کے طور پر، وفاقی بورڈ کے زیر اشاعت مطالعہ پاکستان کی نویں اور دسویں جماعت کی کتب دیکھیں تو اس میں بتایا گیا ہے کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کو جدا کرنے میں 'انڈیا کا کردار' تھا۔ ان کتب کے اسباق میں لکھا گیا ہے کہ انڈین قیادت کو پاکستان کا قیام ایک آنکھ نہیں بھایا اور انھوں نے برصغیر کی تقسیم کے فوراً بعد سے پاکستان توڑنے کی سازشیں شروع کر دی تھیں۔

آگے چل کر انھی اسباق میں بتایا گیا کہ مشرقی پاکستان میں بڑی تعداد میں ہندو رہائش پذیر تھے جن کی ہمدردیاں انڈیا کے ساتھ تھیں، اور وقت کے ساتھ ساتھ وہاں علیحدگی پسند عناصر کو پنپنے کی جگہ ملی اور نتیجتاً مشرقی پاکستان کی عوام ان عناصر کے بیانیے کا شکار ہو گئی۔

محقق اور مصنفہ، انعم زکریا اس حوالے سے اپنی کتاب، '1971، اے پیپلز ہسٹری فرام بنگلہ دیش، پاکستان اینڈ انڈیا' میں لکھتی ہیں کہ ان نصابی کتب میں بیانیہ تمام بنگالی ہندوؤں کو انڈیا کا حامی اور بطور 'غدار' پیش کرتا ہے 'اسی لیے یہ قطعی حیرانی کی بات نہیں ہے کہ پاکستان میں عمومی تاثر یہی ہے کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے ٹوٹ جانے کی وجہ انڈیا تھا۔'

اب جب اگلے چند روز میں بنگلہ دیش اپنے قیام کے 50 برس مکمل کرنے والا ہے، بی بی سی نے مختلف تحقیقی کتب کے حوالہ جات اور محققین سے گفتگو میں یہ جاننے کی کوشش کی ہے کہ وہ کون سے عوامل تھے جن کی وجہ سے اپنے قیام کے محض 24 برس بعد پاکستان دولخت ہو گیا، کیا ایسا ہونا ناگزیر تھا، اور کیا ان دونوں ملکوں کے تعلقات کی سرد مہری مستقبل کی گرمجوشی میں تبدیل ہو سکے گی؟

'جہاں تک ریاستی زبان کا سوال ہے، وہ صرف اردو ہو گی'

اگست 1947 میں جب پاکستان وجود میں آیا تو وہ دو بڑے خطوں پر مشتمل تھا۔ مشرقی پاکستان جہاں ملک کی 56 فیصد آبادی رہائش پذیر تھی جو کہ بنگلہ زبان بولنے والے تھے جبکہ مغربی پاکستان میں پنجابی، سندھی، بلوچی، پشتو اور دیگر مقامی زبانیں بولنے والے بستے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ انڈیا سے ہجرت کرنے والے مسلمان تھے جو اردو بولنے والے تھے اور آبادی میں ان کا تناسب تین فیصد تھا۔ بنگلہ دیش کی تاریخ پر تحقیق کرنے والے ولندیزی پروفیسر ولیم وان شینڈل اپنی کتاب 'اے ہسٹری آف بنگلہ دیش' میں لکھتے ہیں کہ پاکستان کے قیام کے فوراً بعد 'شمالی انڈیا' سے تعلق رکھنے والوں کی بالادستی ابھر کر سامنے آئی۔ وہ لکھتے ہیں کہ جہاں ایک جانب بنگلہ دیشی مسلمانوں کو توقع تھی کہ وہ اکثریتی آبادی ہونے کے ناطے اس نئے ملک میں اپنا اہم کردار ادا کریں گے، وہیں 'شمالی انڈیا' سے تعلق رکھنے والے مسلمان رہنماؤں نے ملک کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے لی کیونکہ وہ 'جنوبی ایشیا میں مسلمانوں کی تحریک کے رکھوالے سمجھتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ پاکستان کا مستقبل انھی کے نظریے کے تحت ہو گا۔'

ولیم شینڈل اس پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مغربی پاکستان میں بسنے والے 'شمالی انڈین' مسلمان دو گروہوں پر مبنی تھے اور ملک کے سیاہ و سفید کے مالک تھے۔

ان میں ایک وہ جو ہجرت کر کے آنے والے مہاجر تھے جو اردو زبان بولتے تھے اور ہجرت کے بعد اقلیت میں ہونے کے باوجود انھیں توقع تھی کہ ان کے رسم و رواج مقامی ثقافت پر غالب رہیں گے۔ اور دوسرا گروہ وہ پنجاب میں رہنے والے مسلمانوں کا تھا جو سویلین اداروں، فوج اور زرعی زمینوں کے مالک تھے اور ملک میں واضح اکثریت بن کر سامنے آئے۔

ولیم شینڈل زبان کے حوالے سے اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان ابتدائی تنازعہ اسی بنیاد پر ہوا مغربی پاکستان میں رہنے والوں کی اکثریت کو بنگلہ زبان کے بارے میں علم نہیں تھا اور ان کے نزدیک اس زبان پر 'ہندوؤں کا اثر' تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جب فروری 1948 میں ایک بنگالی رکن اسمبلی نے قرارداد پیش کی کہ اردو کے ساتھ ساتھ بنگلہ زبان کو بھی اسمبلی میں استعمال کیا جائے، تو ملک کے وزیر اعظم لیاقت علی خان نے جواب میں کہا: 'پاکستان برصغیر کے کروڑوں مسلمانوں کے مطالبے پر قائم ہوا

ہے اور ان تمام مسلمانوں کی زبان اردو ہے۔ یہ اہم ہے کہ اس قوم کی ایک زبان ہو اور وہ زبان صرف اور صرف اردو ہو سکتی ہے۔'

اگلے ہی ماہ جب مارچ 1948 میں بانی پاکستان محمد علی جناح نے ڈھاکہ کا دورہ کیا تو انھوں نے بھی اپنے خطاب میں بڑے دوٹوک انداز میں کہا: 'یہ میں واضح کرنا چاہتا ہوں کہ پاکستان کی ریاستی زبان صرف اردو ہو گی۔ اور اگر کوئی آپ کو اس سے گمراہ کرے تو وہ پاکستان کا دشمن ہے۔۔۔ تو جہاں تک ریاستی زبان کا تعلق ہے، وہ صرف اردو ہے۔'

جنوبی ایشیا کی تاریخ کے ایک اور ماہر اور مصنف، نیلش بوس اپنی کتاب 'ری کاسٹنگ دا ریجن' میں اسی بارے میں لکھتے ہیں کہ چند بنگالی دانشور محمد علی جناح کے ساتھ جنوری 1948 سے بنگلہ زبان کی حیثیت کے حوالے سے گفتگو کر رہے تھے لیکن ان کی شنوائی نہیں ہوئی اور محمد علی جناح نے اس بات پر زور دیا کہ نجی طور پر مشرقی پاکستان میں بنگلہ زبان استعمال ہوتی رہے لیکن سرکاری طور پر اردو ہی مرکزی زبان رہے گی۔

اس حوالے سے جب بی بی سی نے امریکہ کی جارج میسن یونیورسٹی سے منسلک پروفیسر احسن بٹ سے سوال کیا تو ان کا کہنا تھا پاکستان کے بانیوں کی اپنی زبان اردو تھی اور شاید وہ اردو کو اسلام سے جوڑ رہے تھے۔

علیحدگی پسندوں کی تحاریک پر کتاب کے مصنف پروفیسر احسن بٹ نے سوال اٹھایا کہ انڈیا سمیت دنیا کے بیشتر ممالک کی قومی زبان کوئی نہیں ہے اور یہ سوچنا ضروری ہے کہ ہمیں قومی زبان کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ انعم زکریا سے جب بی بی سی نے اس بارے میں سوال کیا تو انھوں نے اس کا تفصیلی جواب دیتے ہوئے کہا کہ ان کے نزدیک بنگلہ دیش بننے میں مرکزی کردار زبان کی تحریک کا تھا۔ یہ بات صرف اتنی سی نہیں ہے کہ آپ کسی کی زبان کو تسلیم نہیں کر رہے ہیں، بلکہ یہ اس سے بڑھ کر ہے۔ زبان کو دبانے کا مطلب ہے کہ آپ ان کی ثقافت کو دبا رہے ہیں۔ اور پاکستان بننے کے فوراً بعد ایسا ہی ہوا جب ہم نے دیکھا کہ 1952 میں زبان پر ہونے والی تحریک میں طلبہ کی ہلاکت ہوئی۔

ثقافتی تسلط، حق تلفی اور عدم مساوات

جہاں ایک جانب زبان کا معاملہ انتہائی اہمیت کا حامل تھا، وہیں کئی محققین معاشی، سماجی، اور ثقافتی طور پر مشرقی پاکستانیوں کے خلاف برتے گئے رویے اور ان کی حق تلفی کی نشاندہی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ پاکستان ٹوٹنے میں ان عوامل کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ لاہور میں مقیم محقق و مصنف ڈاکٹر طارق رحمان سے جب بی بی سی نے اسی بابت سوال کیا تو ان کا کہنا تھا کہ بنیادی مسئلہ مشرقی پاکستان کے ساتھ حق تلفی کا تھا۔

'چاہے ان کے ساتھ ثقافتی امتیاز رکھا گیا، یا وہ طاقت کے بٹوارے میں امتیاز ہو یا وہ زبان اور معاشی امتیاز ہو، یہ واضح ہے کہ انھیں انصاف نہیں دیا گیا۔'

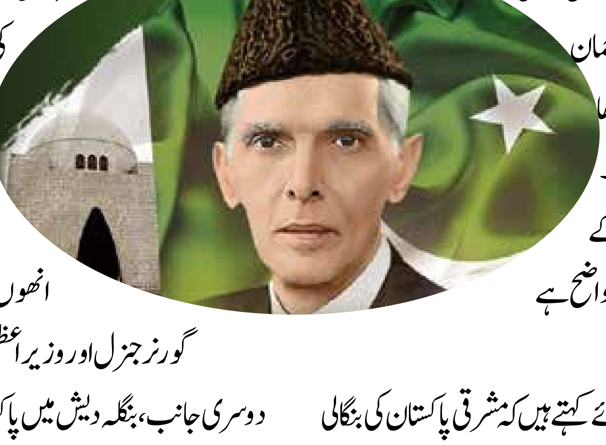

پروفیسر احسن بٹ بھی اسی نکتے کی تائید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مشرقی پاکستان کی بنگالی آبادی کے خلاف عدم مساوات اور ہر طرح کا امتیازی سلوک کرنے سے ان کی آبادی میں وہ غم و غصہ تھا جس کا نتیجہ 1971 کی صورت میں نکلا۔

دوسری جانب انعم زکریا کہتی ہیں کہ دیگر عوامل جیسے معاشی استحصال ہو یا آمریت، ان کی اپنی تحقیق میں جو بات بار بار سامنے آئی وہ مغربی پاکستان کی جانب سے ثقافتی تسلط کا مظاہرہ تھی۔ ان کا کہنا ہے کہ مشرقی پاکستانیوں کے خلاف نسلی نوعیت کے القابات استعمال کیے گئے، انھیں 'کمزور اور کم درجے' کے طور پر دیکھا گیا اور ان کے خلاف نسل پرست رویہ اور بیانیہ بنایا گیا اور کہا گیا کہ ان کی ثقافت 'ہندو' ہے اور اسے 'پاک' کرنا ہے۔ ڈاکٹر طارق رحمان نے بھی اسی حوالے کہا کہ بنگلہ دیشی شہریوں کو توہین آمیز انداز میں پکارا جاتا تھا۔

'میرے نزدیک اگر آپ کسی کے ساتھ انصاف سے پیش نہ آئیں اور انھیں برابر کا شہری سمجھنے کے بجائے نچلے درجے کا شہری سمجھیں تو میری نظر میں یہ ملک ٹوٹنے کی بنیادی وجہ تھی۔' البتہ جب ڈھاکہ یونیورسٹی کی سابق پروفیسر میگھنا گوہاٹھاکرتا سے جب بی بی سی نے اسی بارے میں سوال کیا تو ان کا کہنا تھا کہ زبان اور ثقافت میں تفریق اور معاشی امتیاز بنگلہ دیش کی آزادی کی بڑی وجہ تھے لیکن ان کے نزدیک سب سے اہم وجہ مغربی پاکستان کی مکمل طور پر ملکی فیصلہ سازی پر تسلط کی پالیسی تھی۔

'میرے خیال میں اسلام آباد سے مرکزی حکومت کی مکمل فیصلہ سازی اور ساتھ ساتھ مشرقی حصے میں پیدا ہونے والی کسی بھی مزاحمت کے خلاف جارحیت کا استعمال کر کے اسے دبانے کی کوشش سب سے اہم وجوہات تھیں۔ اگر جمہوری طرز عمل اپنایا جاتا اور وسائل کو مساوات سے بانٹا جاتا تو معاشی اور ثقافتی تفریق کو قابو میں کیا جا سکتا تھا۔' زبان کا تنازع اور مشرقی پاکستانیوں کا استحصال، پاکستانی موقف کیا ہے؟ چند ماہ قبل وفات پا جانے والے سابق بیوروکریٹ اور کالم نویس صفدر محمود اپنی کتاب 'پاکستان کیوں ٹوٹا' میں لکھتے ہیں کہ قیام پاکستان کے بعد ملک کے مختلف حصوں میں صوبائیت کے رجحانات منظر عام پر آنے لگے اور نتیجتاً ڈھاکہ میں مغربی اور مشرقی پاکستان کے درمیان ایک دشمنی پروان چڑھنے لگی جس کا فائدہ چند بائیں بازوں کے سیاستدانوں نے اٹھایا۔

صفدر محمود لکھتے ہیں کہ عوامی لیگ درحقیقت محض ایک صوبائی اور علاقائی مقاصد کا پریشر گروپ تھا جس نے کبھی بھی قومی سیاسی جماعت کا کردار ادا کرنے کی کوشش نہیں کی۔

وہ فروری 1948 میں اسمبلی میں بنگلہ زبان کے استعمال کے لیے پیش کی جانے والی قرارداد کے بارے میں کہتے ہیں کہ وزیر اعظم لیاقت علی خان کی جانب سے اس قرارداد کو رد کرنے سے طالبعلموں اور دیگر تعلیم یافتہ طبقات کو لگا کہ 'مرکزی حکومت جس پر اہل پنجاب کا غلبہ ہے، انھوں نے بنگالیوں سے ان کی مادری زبان چھین لی ہے حالانکہ گورنر جنرل اور وزیر اعظم دونوں میں سے کوئی بھی پنجابی نہیں تھا'۔

دوسری جانب، بنگلہ دیش میں پاکستان کے ہائی کمشنر کا کردار ادا کرنے والے افراسیاب

مہدی ہاشمی اپنی کتاب '1971، فیکٹ اینڈ فکشن' میں لکھتے ہیں کہ عمومی تاثر یہ ہے کہ مغربی پاکستانیوں نے اپنی زبان اردو مشرقی پاکستان پر زبردستی تھوپنے کی کوشش کی لیکن یہ الزام سراسر غلط ہے۔ افراسیاب مہدی لکھتے ہیں کہ اردو برصغیر کے مسلمانوں کی نسل در نسل چلی آئی زبان ہے اور وہ ملک کے دونوں حصوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ انھوں نے موقف پیش کرتے ہوئے کہا کہ اردو عربی زبان سے مماثلت رکھتی ہے جو کہ قرآن کی زبان ہے اور چنانچہ ایک مسلمان ملک ہونے کے ناطے اردو زبان پاکستانی شناخت کے لیے بہتر ہے۔

انھوں نے اپنے خدشہ کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ اگر بانی پاکستان محمد علی جناح بنگلہ کو قومی زبان دینے کے مطالبے کو تسلیم کر لیتے تو ممکن تھا کہ پاکستان مستقبل میں مزید مسائل کا شکار ہوجاتا اور دیگر علاقے بھی اپنی صوبائی زبانوں کا درجہ تبدیل کرنے کا مطالبہ کرتے۔

کیا پاکستان کا ٹوٹنا ناگزیر تھا؟

متعدد محققین اور ماہرین کے نزدیک مشرقی اور مغربی پاکستان کا ساتھ رہنا ممکن نہیں تھا اور وہ اس بارے میں دونوں خطوں کے درمیان ایک ہزار میل سے زیادہ فاصلے کی جانب سے اشارہ کرتے ہیں، جس کے بیچ میں ایک 'دشمن' ملک موجود تھا۔

جبکہ کئی کا کہنا ہے کہ دونوں علاقوں میں سیاسی، معاشی اور سماجی تفریق اتنی زیادہ تھی کہ ان کا زیادہ عرصے تک ساتھ رہنا ممکن نہ ہوتا۔ ڈاکٹر طارق رحمان سے جب یہ سوال کیا تو ان کا کہنا تھا کہ شروع سے ہی صوبائی اور وفاقی حیثیت ہونے کی وجہ سے طاقت کا محور مغربی پاکستان تھا۔ 'وفاق پٹ سن کی فروخت سے ملنے والی رقم پر ٹیکس لیتا اور اسے استعمال کرتے ہوئے ملک کی دفاعی ضروریات پر پورا کرتا تھا۔'

ولیم وان شینڈل بھی اپنی کتاب میں اس بارے میں روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ 1947 سے لے کر 1970 تک پاکستان کے کل اخراجات کا نصف سے زیادہ حصہ دفاع میں خرچ ہوا۔ انھوں نے مزید لکھا کہ پاکستان اپنا دو تہائی غیر ملکی زرمبادلہ پٹ سن کی فروخت سے حاصل کر رہا تھا لیکن وہ تقریباً تمام مغربی پاکستان میں لگ رہا تھا۔

ڈاکٹر طارق رحمان کہتے ہیں کہ اس کے علاوہ ترقیاتی منصوبوں کی بھی اکثریت مغربی پاکستان میں تھی اور لوگوں کا رویہ بھی مشرقی پاکستانیوں کے خلاف 'تضحیک آمیز' تھا۔

مشرقی پاکستان کی سیاسی جماعت عوامی لیگ کے رہنما شیخ مجیب الرحمان کا حوالہ دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اگر انھیں 1970 کے انتخابات میں جیت کے بعد حکومت مل بھی جاتی تو بھی ملک یکجا نہ رہتا۔ 'شیخ مجیب نے بارہا اس بات کا اشارہ کیا تھا کہ وہ دفاعی بجٹ میں کمی لائیں گے تاکہ مشرقی پاکستان میں ترقیاتی منصوبے شروع کیے جائیں لیکن ملک کا سب سے طاقتور ادارہ، فوج ایسا کرنے کا متحمل نہ ہوتا کہ اپنے بجٹ میں کمی لائے۔ تو میرا نہیں خیال کہ دونوں حصے زیادہ عرصے ساتھ رہ پاتے۔' البتہ پروفیسر میگھنا گوہاٹھاکرتا نے اسی سوال کے جواب میں کہا کہ کئی لوگ دونوں خطوں کے درمیان فاصلے کو سامنے رکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ جدا ہونا ناگزیر تھا لیکن یہ ضروری نہیں ہے۔

'یہ اس لیے نہیں ہوا کہ دونوں دور ہیں۔ بلکہ حکومت پاکستان اس بات کو تسلیم نہیں کر سکی کہ ان کے ملک کے دوسرے حصے میں رہنے والوں کی ثقافتی اور معاشی خواہشات کیا ہیں اور وہ بھی ایک ایسا حصہ جو ملک کی اکثریت آبادی پر مشتمل ہے۔'

دوسری جانب انعم زکریا کہتی ہیں کہ پاکستان کو ایسا سمجھنا ہی نہیں چاہیے کہ علیحدگی ناگزیر تھی۔ 'اگر ہم یہ سوچ کر چلیں کہ یہ ہونا ناگزیر تھا، تو ہم اس کی وجوہات پر کبھی غور نہ کر سکیں۔ بہت سارے عوامل اور واقعات تھے جو ان 24 برسوں میں ہوئے اور حالات کو اس نہج تک لے گئے۔ یہ یاد رکھیں کہ مشرقی بنگال ہی وہ مقام تھا جہاں مسلم لیگ قائم ہوئی تھی اور وہاں پر پاکستان کے لیے بے انتہا حمایت تھی۔' میری نظر میں یہ ناگزیر نہیں تھا بلکہ اس کی وجہ وہ پالیسیاں تھیں جنھیں جان بوجھ کر نافذ کیا گیا جس کی مدد سے ملک کی آبادی کے بڑے حصے کو باقاعدہ طور پر دبایا گیا، صرف اس لیے کہ وہ اپنے حقوق کا مطالبہ کر رہے تھے۔'

شیخ مجیب الرحمان کی مقبولیت، اگرتلہ سازش اور 1970 کے انتخابات

پاکستان کی تاریخ کو پڑھا جائے تو اکثر 60 کی دہائی کو پاکستان کی ترقی کی دہائی کہا جاتا ہے جب فیلڈ مارشل ایوب خان ملک کی بحیثیت صدر قیادت کر رہے تھے۔

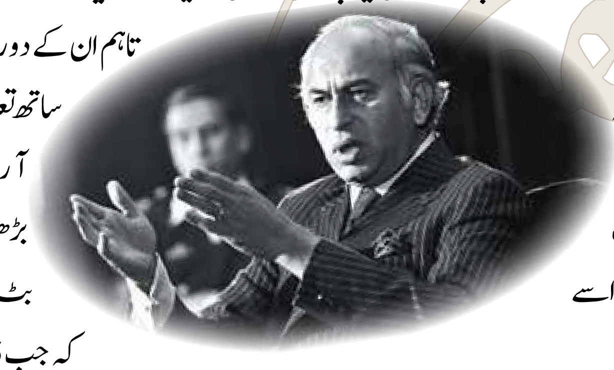

تاہم ان کے دور میں مشرقی پاکستان کے ساتھ تعلقات میں مسلسل بگاڑ چلتا آ رہا تھا اور احساس محرومی بڑھتا جا رہا تھا۔ پروفیسر احسن بٹ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ جب 1965 میں پاکستان اور انڈیا کے درمیان جنگ ہوئی تھی تو اس وقت مشرقی پاکستان میں برائے نام دفاعی سہولیات تھیں جس میں محض ایک ڈویژن فوج اور 15 سیبر جنگی طیارے تھے جبکہ مغربی پاکستان سے مواصلات نہ ہونے کے برابر تھیں۔ انھوں نے مزید لکھا کہ پاکستان کی دفاعی حکمت عملی 'مشرق کا دفاع مغرب سے' تھی اور جب انڈیا نے حملہ کیا تو مشرقی پاکستان کے شہریوں کو اندازہ ہوا کہ ان کی حفاظت مغربی پاکستان کے لیے ترجیح نہیں رکھتی۔

اسی پس منظر میں جب عوامی لیگ کے شیخ مجیب نے اگلے سال لاہور میں چھ نکات پر مبنی اپنا ایجنڈا پیش کیا تو انھیں شدید تنقید کا سامنا کرنا پڑا اور اسے 'انڈین سازش' قرار دیا گیا۔

چند ماہ قبل بی بی سی اردو پر فاروق عادل نے ایک مضمون میں ان نکات کے بارے میں لکھا کہ 'شیخ مجیب کا کہنا تھا کہ صوبائی خود مختاری اس لیے بھی ضروری ہے تاکہ صوبوں کی اقتصادی ترقی میں یکسانیت پیدا ہو سکے۔ انھوں نے کہا کہ مشرقی پاکستان کی آبادی پانچ کروڑ ہے،

اس لیے ملک کے دفاع میں بھی اس کا حصہ آبادی کے تناسب سے ہونا چاہیے، اس طرح ملک کا اتحاد مضبوط ہو گا، کمزور نہیں۔' لیکن ان کی دی گئی تجاویز کو نہ صرف نظر انداز کیا گیا بلکہ 1968 میں شیخ مجیب الرحمان کے خلاف 'اگرتلہ سازش' کیس کے تحت مقدمہ درج کر لیا گیا اور ان پر الزام عائد کیا گیا کہ وہ انڈین حکومت کے ساتھ مل کر مشرقی پاکستان کو توڑنے کی سازش کر رہے ہیں۔ سابق سفیر افراسیاب مہدی نے مغربی پاکستان کی جانب سے مشرقی صوبے کے معاشی اور سماجی استحصال کرنے کے الزامات پر اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ کہا جاتا ہے کہ پاکستان کے دو بنگالی رہنما، خواجہ ناظم الدین اور حسین شہید سہروردی کو بہت کم دور حکومت ملا لیکن یہ بات لوگ بھول جاتے ہیں کہ 50 کی دہائی میں پاکستان کے دیگر غیر بنگالی رہنماؤں کو بھی زیادہ عرصے حکومت کرنے کا موقع نہیں ملا۔

انھوں نے مزید لکھا کہ محمد علی جناح کی وفات کے بعد پاکستان نے سیاسی عدم استحکام کا سامنا کیا جس کے نتیجے میں حالات نے ایسی شکل اختیار کی۔ اگر حکومت پاکستان کا خیال تھا کہ اگرتلہ سازش کیس کی وجہ سے شیخ مجیب الرحمان کی ساکھ کو نقصان پہنچے گا، تو یہ اس کی بھول تھی۔ نہ صرف ان کے حق میں مشرقی پاکستان میں بھرپور آواز بلند ہوئی بلکہ وہ اس خطے کے سب سے اہم اور سب سے مقبول لیڈر بن کر ابھرے اور انھیں 'بنگہ بندھو' یعنی 'بنگال کے دوست' کا خطاب ملا۔ پاکستان کے نئے آمر، جنرل یحییٰ خان کی حکومت میں 1970 کے انتخابات منعقد ہوئے تو ان کی پارٹی عوامی لیگ نے مشرقی پاکستان میں 162 میں سے 160 نشستیں جیت کر واضح اکثریت حاصل کر لی لیکن اسے حکومت بنانے کا موقع نہیں مل سکا۔

انتخابات میں واضح جیت کے باوجود حکومت نہ ملنے کے بارے میں سفیر افراسیاب مہدی نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ یہ سمجھنا کہ اسلام آباد کو شیخ مجیب الرحمان کے انڈیا سے گٹھ جوڑ کا علم نہیں تھا، ایک بچکانہ بات ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ بنگلہ دیش میں آج بھی یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ انڈین خفیہ ایجنسی نے شیخ مجیب کو نہ صرف 1970 کے عام انتخابات کے لیے مالی امداد فراہم بلکہ جب جب انھیں پاکستان کو نقصان پہنچانے کے لیے رقم کی ضرورت ہوئی انھیں وہ فراہم کی گئی۔ تاہم پروفیسر احسن بٹ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ ان نتائج کو تسلیم نہیں کیا گیا اور 'فوج اور ذوالفقار علی بھٹو نے شیخ مجیب کو ان کا حق نہیں دیا۔' تو کیا یہ وہ موڑ تھا جب یہ یقینی ہو گیا تھا کہ مغربی اور مشرقی پاکستان علیحدہ ہو جائیں گے، اس سوال پر پروفیسر احسن بٹ کہتے ہیں کہ وہ یہ مناسب نہیں سمجھتے کہ کسی ایک واقعہ کو 'فیصلہ کن موڑ' کہا جائے لیکن 1970 کے انتخابات کے بعد ہونے والے واقعات نے پاکستان کے ٹوٹنے کی راہ ضرور ہموار کر دی تھی۔

ڈاکٹر طارق رحمان سے جب یہی سوال کیا گیا تو انھوں نے مارچ 1971 کے واقعات کی جانب اشارہ کیا۔ انھوں نے بتایا کہ انتخابات کے نتائج کے بعد تینوں مرکزی کرداروں، ذوالفقار علی بھٹو، شیخ مجیب الرحمان اور صدر یحییٰ خان نے متعدد ملاقاتیں کیں اور بالآخر صدر یحییٰ خان نے 3 مارچ کو ڈھاکہ میں نو منتخب اسمبلی کا اجلاس بلانے کی تاریخ دی۔

'لیکن انھوں نے بعد میں نئی تاریخ (25 مارچ) دے دی اور پھر جب فوج نے 25 مارچ کو فوجی آپریشن (آپریشن سرچ لائٹ) شروع کر دیا تو بس پھر حالات ہاتھ سے نکل گئے اور پھر واپسی کی کوئی صورت نہ بچی۔'

ڈاکٹر طارق رحمان کہتے ہیں کہ اپریل تک مشرقی پاکستان میں حالات انتہائی مخدوش ہو چکے تھے اور عوام نے مکتی باہنی میں شمولیت شروع کر دی تھی جبکہ دوسری جانب انڈیا نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ بنگلہ دیش کی 'آزادی کی جدوجہد' میں اپنا کردار ادا کرے گا۔

البتہ پروفیسر میگھنا گوہا ٹھاکرتا نے بھی اسی بات کو دہراتے ہوئے کہا کہ صدر یحییٰ خان کی جانب سے وہ پارلیمانی اجلاس ملتوی کرنا جس میں شیخ مجیب الرحمان اور عوامی لیگ کو حکومت ملنی تھی، وہ تھا فیصلہ کن مرحلہ جس کے بعد حالات ہاتھ سے نکل گئے۔

'نسل کشی' اور 'جنگی جرائم' کے الزامات اور مستقبل کا سوال

حکومت پاکستان کی جانب سے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بارے میں تحقیق کے لیے قائم کیے گئے 'حمود الرحمان کمیشن' کی رپورٹ میں پاکستانی افواج کی جانب سے کی گئی مبینہ 'بربریت' کے باب میں لکھا گیا ہے کہ 'یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ عوامی لیگ کے عسکریت پسندوں نے مارچ کے مہینے میں کس قدر ظلم اور بربریت برپا کی تھی۔' رپورٹ کے مطابق مبینہ طور پر اندازاً 'ایک لاکھ سے پانچ لاکھ بہاری، مغربی پاکستانی اور محب وطن بنگالی' افراد کو ہلاک کیا گیا۔ پاکستان اور بنگلہ دیش کے تعلقات کے مستقبل کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر طارق نے کہا کہ یہ بالکل ممکن ہے کہ دونوں کے درمیان دوستانہ تعلقات ہو سکیں اور جنوبی افریقہ کی طرز پر حقائق اور مفاہمت پر مبنی کمیشن بنے تو کچھ ہو سکتا ہے۔

'لیکن ایسا ہونے کے لیے سب سے پہلے ضروری ہے کہ پاکستان بنگلہ دیش سے صدق دل سے معافی مانگے۔ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ مارچ 1971 میں جو بہاری افراد بنگلہ دیش میں ہلاک ہوئے ہیں، بنگلہ دیش کو بھی ان افراد اور ان کے خاندان سے معافی مانگنی ہو گی۔ لیکن سب سے پہلے پاکستان کو معافی مانگنی ہو گی، زیادہ عاجزی دکھانی ہو گی۔'

انھوں نے امید کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اگر ایسا ہوتا ہے تو یہ بالکل ممکن ہے کہ تعلقات میں بہتری ہو۔

البتہ پروفیسر احسن بٹ اس بارے میں زیادہ پر امید نہیں ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جب تک حقائق پر مبنی گفتگو نہیں ہو گی اور شفافیت نہ ہو، آگے بڑھنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

'ہم نے اپنی نصابی کتب کو افسانوں سے بھر دیا ہے اور اگر ہم مسلسل ان واقعات کی تردید کریں گے تو کیا ہو گا؟' وہ کہتے ہیں کہ فی الوقت تو ان دونوں ممالک کے تعلقات میں بہتری ہونا نظر نہیں آتا لیکن یہ بات بھی یاد رکھنا اہم ہے کہ ان کے تعلقات میں سرد مہری صرف تاریخ کی وجہ سے نہیں بلکہ موجود سیاسی حالات اور دونوں ممالک کی موجودہ قیادت کی وجہ سے بھی ہے۔'' پاکستان کے لیے سب سے اہم یہ بات ہے کہ وہ بنگلہ دیش کو انڈیا کے تناظر سے نہ دیکھے بلکہ بحیثیت ایک خود مختار ملک دیکھے اور موجودہ حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے معاملات سے نپٹے۔'

❁❁❁

بیگم وقار النسا

'مادرِ مہربان' جنھوں نے ایک پاکستانی سے ناتا جوڑ کر اپنا جینا مرنا اس کے وطن سے وابستہ کر دیا

تحریر: عقیل عباس جعفری

یہ نومبر 1958 کا واقعہ ہے۔ پاکستان کے ایک وزیر اعظم انڈیا کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی دعوت پر انڈیا پہنچے۔

ابھی وہ جہاز سے اتر ہی رہے تھے کہ ان کے پیچھے پیچھے آنے والی ان کی اہلیہ کی سلیپر کی وضع کی ایک جوتی پاؤں سے پھسل کر سیڑھی سے نیچے جا گری۔ اس سے پہلے کہ وہ سیڑھی طے کر کے نیچے پہنچتیں، پنڈت نہرو نے سلیپر اٹھالی اور جب وہ نیچے اتریں تو ان کے سامنے اس طرح رکھ دی کہ پہننے میں دشواری نہ ہو۔

خوش اخلاقی کے اس سلوک سے نہرو کی وجاہت میں کوئی فرق نہیں آیا بلکہ اس میں کسی قدر اضافہ ہی ہوگیا۔ پاکستان کے یہ وزیر اعظم فیروز خان نون تھے اور ان کی اہلیہ بیگم وقار النسا نون۔ وقار النسا نون کا اصل نام وکٹوریہ ریکھی تھا اور وہ 23 جولائی 1920 کو آسٹریا کے ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوئی تھیں جو نازیوں کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر انگلینڈ میں آباد ہوگیا۔ فیروز خان سے ان کی پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ لندن میں انڈیا کے ہائی کمشنر کے منصب پر تعینات تھے۔ یہ ملاقات سنہ 1942 میں اس وقت شادی پر منتج ہوئی جب فیروز خان نون دہلی میں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر تھے۔ اس وقت فیروز خان نون کی عمر 49 سال اور وکٹوریہ کی عمر 22 سال تھی، یہ شادی بمبئی میں ہوئی۔

اس شادی کے لیے وکٹوریہ نے نہ صرف اسلام قبول کیا بلکہ خود کو مکمل مشرقی اندازِ زندگی میں ڈھال لیا۔ ان کا اسلامی نام وقار النسار رکھا گیا یوں ان کی عرفیت وکی برقرار رہی۔

فیروز خان نون نے ان کی ملاقات قائد اعظم سے کروائی جس کے بعد وقار النسا نون نے خود کو مسلمانوں کے الگ وطن کے مطالبے اور نظریہ پاکستان کو سمجھانے کے لیے خود کو اس عظیم جدوجہد کا حصہ بنالیا۔ فیروز خان نون بعد ازاں ہندوستان کے وزیر دفاع کے منصب پر فائز ہوئے مگر 1945 میں وہ مسلم لیگ کے لیے کام کرنے کی غرض سے اس عہدے سے استعفیٰ دے کر لاہور آ گئے جہاں بیگم وقار النسا نون نے حصول پاکستان کی جدوجہد میں حصہ لیا۔ انھوں نے خواتین کے سیاسی شعور کو بیدار کرنے اور ان میں جوش و ولولہ پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے پنجاب میں مسلم لیگ کی ہائی کمان کے حکم پر خواتین کے جلسے اور جلوسوں میں شرکت کرنا شروع کر دی اور اس دوران آنسو گیس، لاٹھی چارج اور پولیس کے جبر و تشدد کا مقابلہ کیا۔

فیروز خان نون نے اپنی خودنوشت 'چشم دید' میں لکھا ہے کہ

'ان ایام کی کوئی بھی یادداشت اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک میں اپنی بیوی وقار النسا نون کا تذکرہ شامل نہ کروں۔ انھوں نے ہماری گرفتاریوں کے خلاف دفعہ 144 کی خلاف ورزی کرتے ہوئے عورتوں کے احتجاجی مظاہروں کی قیادت کی تھی۔ اس دفعہ کے تحت پانچ سے زائد افراد کا اجتماع ممنوع تھا۔

'قانون کی خلاف ورزی کی بنا پر انھیں کئی بار جیل جانا پڑا۔ ہر جلوس کے بعد انھیں چند دوسری خواتین کے ساتھ جیل پہنچا دیا جاتا اور پھر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ ایک دن پولیس انھیں چند دوسری عورتوں کے ساتھ ایک بس میں بٹھا کر شہر سے سات آٹھ میل دور لے گئی وہاں سے کہا گیا کہ گاڑی سے نیچے اتریں، جب انھوں نے اترنے سے انکار کر دیا تو بس کے اندر گیس کے بم پھینک کر دروازے بند کر دیے گئے۔ وہ اور کچھ دوسری عورتیں بے ہوش ہوگئیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ 'لاہور کی چند خواتین ان دنوں جیل کے صدر دروازے پر رات دن پہرا دیتی تھیں اور کچھ خواتین مظاہرین کے ساتھ ساتھ چلتی تھیں۔ ان کے پاس کاریں ہوا کرتی تھی، چنانچہ جب پولیس کی گاڑی مظاہرین کو بھر کر کسی طرف کو روانہ ہوتی تو یہ کارکن خواتین فوراً ان کا پیچھا کرتیں اور جب پولیس انھیں شہر سے دور لے جا کر چھوڑتی تو وہ انھیں کاروں میں بٹھا کر لے آتی تھیں۔ وقار النسا اور ان کے ساتھیوں کو میرا بڑا بیٹا نور حیات کار میں واپس لایا تھا۔

نور الصباح بیگم نے اپنی کتاب 'تحریک پاکستان اور خواتین' میں لکھا ہے کہ 'سنہ 1947 میں فیروز خان نون نے ضلع کانگڑا میں اپنی اہلیہ کے قیام کے لیے ایک خوب صورت بنگلہ خریدا۔ ان دنوں کسی کو بھی یہ اندازہ نہیں تھا کہ لوگوں کو اپنی آبائی جائیدادوں کو چھوڑ کر جانا پڑے گا اور یہ جائیدادیں یا تو تباہ کر دی جائیں گی یا وہاں کی حکومت ان پر قبضہ کرلے گی۔ اس لیے یہ مکان جو بیگم نون کے لیے خریدا گیا تھا اسے نذر آتش کر دیا گیا اور وہ سکھوں کی ننگی کرپانوں سے گزرتی ہوئی چند نوکروں کے ہمراہ جان بچا کر بمشکل اس جگہ سے نکلیں۔

ان کے شوہر کے دوست راجہ صاحب آف منڈی نے، جو قریب ہی ایک چھوٹی سی ریاست کے راجہ تھے، انھیں تین ہفتے اپنے گھر میں پناہ دی اور سنہ 1947 میں ستمبر کے وسط میں میں انھیں سیالکوٹ پہنچا دیا۔

قیام پاکستان کے بعد فیروز خان نون مشرقی پاکستان میں گورنر اور پنجاب میں وزیر اعلیٰ کے عہدوں پر فائز ہوئے۔ اس دوران بیگم وقار النسا نون نہایت مستعدی اور

خلوص کے ساتھ ان کا ہاتھ بٹاتی رہیں۔ 1947 میں پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو سب سے بڑا مسئلہ بے سروسامان مہاجروں کی آبادکاری کا تھا۔

بیگم نون خود ان مصائب کا سامنا کر چکی تھیں چنانچہ انھوں نے اپناؤہی ریڈ کراس کا کام پاکستان میں شروع کیا جو کہ دوسری جنگ عظیم کے دوران وہ دہلی میں انجام دے رہی تھیں۔ 1948 میں جب رعنا لیاقت علی خان نے اپوا قائم کی تو وہ اس کی بانی رکن بن گئیں۔

جب فیروزخان نون مشرقی پاکستان کے گورنر بنے تو بیگم وقار النسا نون نے اپوا کو مشرقی پاکستان میں بھی منظم کیا۔ انھوں نے ڈھاکا اور راولپنڈی میں دو سکول بھی قائم کیے۔ راولپنڈی والا اسکول 1966 میں کالج میں تبدیل ہو گیا۔

سنہ 1953 میں جب فیروز خان نون وزیر اعلیٰ پنجاب کے منصب پر فائز ہو کر لاہور تشریف لائے تو لاہور بیگم وقار النسا نون کی ان تھک اور پرخلوص سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ اسی برس وہ ریڈ کراس سوسائٹی اور سینٹ جان ایمبولینس ایسوسی ایشن کی صدر منتخب ہوئیں۔

بیگم وقار النسا نون نے 1954 میں ٹورنٹو میں انٹرنیشنل کانفرنس آف سوشل ورک اور کیوٹو میں پیسیفک ریلیشنز کانفرنس میں پاکستان کی نمائندگی کی۔

سنہ 1956 سے 1958 کے دوران جب فیروزخان نون وزارت خارجہ اور وزارت عظمیٰ کے عہدوں پر فائز تھے تو انھوں نے چین، ایران، ترکی اور روس کے سرکاری دورے کیے۔

اسی دوران ان کی کوششوں کے نتیجے میں پاکستان فیملی پلاننگ ایسوسی ایشن کا قیام عمل میں آیا۔ بیگم وقار النسا نون کی یہ تمام سماجی اور رفاحی خدمات ایک طرف لیکن ان کا اصل کارنامہ کچھ اور ہے جس کی وجہ سے وہ پاکستان کی تاریخ میں ہمیشہ ایک اہم مقام پر فائز رہیں گی۔

یہ 1581 کی بات ہے جب بلوچستان کے ساحلی شہر گوادر پر پرتگالیوں نے قبضہ کیا تھا۔ سترہویں صدی کے اوائل میں اس شہر پر گچکی بلوچوں کی حکومت قائم ہوئی۔ 1736 میں انھوں نے گوادر کو ایران کے نادر شاہ کے حوالے کر دیا۔ تین سال بعد پھر گچکی قبیلہ برسر اقتدار آ گیا مگر 1778 میں خان آف قلات نے گوادر پر قبضہ کر لیا۔

سنہ 1784 میں مسقط کے شہزادے سعد سلطان نے اپنے باپ سے بغاوت کر کے جب مکران میں پناہ حاصل کی تو خان آف قلات ناصر خان اول نے ان کی بڑی خاطر مدارات کی اور ان کی مہمانی کے طور پر گوادر کا علاقہ ان کے حوالے کر دیا۔

ایک روایت یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ ناصر خان اول نے سعد سلطان سے اپنی بیٹی کی شادی کر دی تھی اور گوادر کا علاقہ انھیں اپنی بیٹی کے جہیز میں عطا کیا تھا تا کہ اس علاقے سے ہونے والی آمدنی سے سعد سلطان اور ان کے اہل خانہ کا گزارا ہو سکے۔ 1792 میں سعد سلطان خان آف قلات کی مدد سے مسقط اور عمان کے سلطان بن گئے لیکن انھوں نے گوادر کو اپنی عملداری میں شامل رکھا حالانکہ اب وہ گوادر کی آمدنی کے محتاج نہ تھے۔

انگریزوں نے جب قلات پر قبضہ کیا تو یہ صورتحال بدستور قائم رہی۔ 1947 میں قیام پاکستان کے وقت بھی گوادر سلطنت عمان کا حصہ تھا۔

پاکستان نے اپنے قیام کے فوراً بعد گوادر کی بازیابی کے لیے آواز اٹھائی۔ 1949 میں اس مسئلے کے حل کے لیے مذاکرات بھی ہوئے جو کسی فیصلے کے بغیر ختم ہوئے، ادھر شہنشاہ ایران گوادر کو ایران میں شامل کرنے اور اسے چاہ بہار کی بندرگاہ کے ساتھ ملا کر توسیع دینے کے خواہش مند تھے۔ ان کی اس خواہش کی پشت پناہی امریکی سی آئی اے کر رہی تھی۔

سنہ 1956 میں جب فیروزخان نون پاکستان کے وزیر خارجہ بنے تو انھوں نے یہ مسئلہ دوبارہ زندہ کیا اور اسے ہر صورت میں حل کرنے کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے یہ مشن وقار النسا نون کو سونپ دیا، جنھوں نے انتہائی محنت کے ساتھ یہ مسئلہ حکومت برطانیہ کے سامنے پیش کیا۔

انھوں نے گوادر پر پاکستانی استحقاق کے حوالے سے برطانوی حکومت اور پارلیمانی حلقوں میں زبردست مہم چلائی۔ اس سلسلے میں انھوں نے چرچل سے بھی ملاقات کی اور برطانیہ کے ہاؤس آف لارڈز یعنی ایوانِ بالا میں بھی پاکستان کی بھرپور لابیئنگ کی اور یہ مؤقف پیش کیا کہ گوادر قلات خاندان کی جاگیر تھا جو اب پاکستان میں شامل ہے لہٰذا قلات کی اس جاگیر کی وراثت پر بھی اب پاکستان کا حق تسلیم ہونا چاہیے۔

وقار النسا نون نے یہ جنگ تلوار کی بجائے محض قلم، دلائل اور گفت و شنید کی مدد سے جیتی جس میں برطانیہ کے وزیر اعظم ہیرالڈ میکملن نے کلیدی کردار ادا کیا۔ آٹھ ستمبر 1958 کو گوادر کا علاقہ پاکستان کا حصہ بن گیا۔ اسی روز آغا عبدالحمید نے صدر پاکستان کے نمائندہ کی حیثیت سے گوادر اور اس کے نواحی علاقوں کا نظم و نسق سنبھال لیا۔

ایک ماہ بعد اکتوبر 1958 میں ملک میں مارشل لا کے نفاذ کے ساتھ ہی فیروز خان نون کی وزارت عظمیٰ کا خاتمہ ہو گیا تاہم بیگم وقار النسا نون کی سماجی اور رفاحی خدمات کا سلسلہ جاری رہا۔ وہ ایک طویل عرصے تک پاکستان ریڈ کراس سوسائٹی اور سینٹ جان ایمبولینس کی چیئر پرسن رہیں۔ وہ قائد اعظم یونیورسٹی کی سنڈیکیٹ اور پاکستان ٹورزم ڈیولپمنٹ کارپوریشن کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کی رکن رہیں۔ 1978 میں جنرل ضیا الحق نے انھیں مشیر کے عہدے پر فائز کیا اور وزیر مملکت برائے سیاحت مقرر کیا۔

1979 میں انھوں نے پاکستان ٹورزم ڈیولپمنٹ کارپوریشن کی چیئر پرسن کا عہدہ سنبھالا۔ انھوں نے پاکستان میں یوتھ ہاسٹلز کے قیام اور ترقی میں بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ 1987 میں انھیں پرتگال میں پاکستان کا سفیر مقرر کیا گیا، اس منصب پر وہ دو سال فائز رہیں۔ بیگم وقار النسا نون کئی غیر سرکاری تنظیموں کی بھی روح رواں رہیں جن میں سینیئر سٹیزن فاؤنڈیشن، وائلڈ لائف فنڈ اور انگلش سپیکنگ یونین کے نام سرفہرست ہیں۔

بیگم وقار النسا نون نے اپنے دورۂ روس کی یادداشتوں کو سفرنامے کی شکل بھی دی۔ انھیں متعدد ملکی اور بین الاقوامی اعزازات بھی ملے۔ 23 مارچ 1958 کو گوادر کو پاکستان میں شامل کروانے کی جدوجہد میں نمایاں کردار ادا کرنے پر حکومت پاکستان نے انھیں نشان امتیاز کے اعزاز سے سرفراز کیا۔ مگر ان کا سب سے بڑا اعزاز 'مادر مہربان' کا خطاب تھا جو انھیں پاکستانی عوام نے عطا کیا تھا۔

ڈاکٹر منیر احمد سلیچ نے اپنی کتاب 'تنہائیاں بولتی ہیں' میں لکھا ہے کہ 'یورپ میں پیدا ہونے والی اس عظیم خاتون نے جب ایک پاکستانی سے ناتا جوڑا تو اپنا تن من دھن سب اس پر اور

اس کی قوم پر قربان کر دیا۔ انھوں نے کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور سر نون کی وفات کے بعد بھی اپنا جینا مرنا اپنے شوہر کے وطن کے ساتھ وابستہ رکھا۔

بیگم وقار النسا نون کی اپنی اولاد نہیں تھی لیکن وہ فیروز خان نون کی پہلی اہلیہ کے بیٹوں کو سگی اولاد کی طرح چاہتی تھیں اور وہ بھی ان کا احترام سگی ماں کی طرح کرتے تھے سر نون بھی ان سے بے کراں محبت کرتے تھے اور لاہور مسلم ٹاؤن میں انھوں نے اپنی وسیع و عریض کوٹھی کا نام الوقار رکھا تھا۔ وقار النسا نون نے عورتوں، بچوں اور غریبوں کی امداد کو تاعمر اپنا وظیفہ بنائے رکھا۔ انھیں اپنے شوہر کی جائیداد کی آمدنی سے جو حصہ ملتا وہ بھی بھلائی کے کاموں میں لگا دیتیں، انھوں نے کیمبرج اور آکسفرڈ یونیورسٹیوں میں پاکستانی طالب علموں کے لیے دو وظائف بھی مقرر کر رکھے تھے۔

بیگم وقار النسا نون سنہ 2000 میں 16 جنوری کو اسلام آباد میں وفات پا گئیں، جہاں انھیں ایچ 8 کے قبرستان میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

قارئین کے لیے خوشخبری

آپکی پسندیدگی اور نیک تمناؤں کی بدولت ماہنامہ لاہور انٹرنیشنل اپنی ترقی کی منازل کی طرف رواں دواں ہے۔ جنوری 2018ء سے ادارہ لاہور انٹرنیشنل نے قارئین کے لیے ایک نئی ویب سائٹ تشکیل دی ہے۔ جو جدید تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ اسکا URL درج ذیل ہے

www.lahoreinternational.com

قارئین کرام اس ویب سائٹ پر اہم خبریں، مضامین اور دیگر شعبہ جات سے متعلق موثر مضامین اور عالمی خبریں بھی ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ آپ کی تجاویز اور تبصروں کی روشنی میں اس سائٹ کو مزید سے مزید بہتر بنانے کیلئے "ادارہ" پر عزم ہے۔

ویب سائٹ پر اُردو اور انگریزی دونوں رسالے اور مواد موجود ہے۔ تمام دنیا میں یہ رسالہ اب ماشاء اللہ لاکھوں کی تعداد میں قارئین کے زیر مطالعہ ہے۔ جس قلیل مدت میں قارئین نے اس رسالہ کو پسند کیا ہے اس کیلئے ہم تمام قارئین کے تہہ دل سے مشکور ہیں۔ دنیائے صحافت میں آپ کی قدر دانی سے رسالہ نے جو مقام حاصل کیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔

اب ہماری کوشش ہے کہ اسکو جلد از جلد "ہفتہ وار" کر دیا جائے اور آپ دوستوں کی دعاؤں کے بغیر یہ ممکن نہیں۔ اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔

(ادارہ لاہور انٹرنیشنل لندن)

ICAEW CHARTERED ACCOUNTANTS

SARMAD GLOBAL
CHARTERED ACCOUNTANTS

QUALIFIED CHARTERED ACCOUNTANTS WITH BIG4 EXPERIENCE

FREE TELEPHONE / EMAIL & WHATSAPP SUPPORT

- Company Incorporation / Registered Office Address
- Private UK Pension Tracing
- Personal Income Tax Return investigations
- Assets Review for Inheritance Tax
- Rental Income Tax Returns
- Appealing - Past years HMRC Penalties
- UK State Pension Entitlement Review
- Preparation / Filing of prior year tax returns
- Advise on fil l ing Gaps in UK State Pension
- Duplicate - Payslips / P60s
- UK State Pension / (Contracted Out) Tracing

SARMAD KHAN | ACA, FCCA

OFFICE 115 LONDON ROAD, MORDEN, SURREY SM4 5HP - UK

CELL +44 (0)7903 416 966

TEL +44 (0)208 646 3666 FAX +44 (0)208 082 5002

EMAIL INFO@SARMADGLOBAL.COM WEB WWW.SARMADGLOBAL.COM

عقل مند لوگو! معیشت ہی میں راہ نجات ہے

تحریر: وجاہت مسعود

مارچ 1971 کے دن تھے جب قائداعظم کے پاکستان کی بنیاد کھودی جا رہی تھی۔ مشرقی پاکستان میں شفیع الاعظم چیف سیکرٹری تھے جنہیں عملی طور پر حکومت اور شیخ مجیب الرحمن کے درمیان رابطہ کار کی حیثیت بھی حاصل تھی۔ ایک اعلیٰ فوجی افسر نے خانہ جنگی کے بڑھتے ہوئے خدشات کے پیش نظر شفیع الاعظم سے کہا کہ وہ شیخ مجیب الرحمن کو عوامی جذبات ٹھنڈا کرنے پر قائل کریں۔ شفیع الاعظم نے بغیر کسی جھجک کے زمینی حقیقت بیان کرتے ہوئے کہا، 'جنرل صاحب آپ کے پاس توپیں اور بندوقیں ہیں، شیخ صاحب کے پاس عوامی جذبات ہیں۔ شیخ صاحب عوامی جذبات کو ٹھنڈا نہیں ہونے دیں گے'۔ پچاس برس پرانا یہ واقعہ دہرانے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ میں خود کو واقعہ سیالکوٹ کی بے معنی مذمت سے قاصر پاتا ہوں۔ اس ضمن میں جو مذمتی بیانات سامنے آئے ہیں، انہیں پڑھتے ہوئے مردہ مکھیاں دیکھنے کا گھن آلود احساس ہوتا ہے۔ البتہ مولانا فضل الرحمن اور مفتی منیب کے بیانات سے یہ قضیہ سمجھنے میں کسی حد تک مدد ملتی ہے۔

مولانا فضل الرحمن فرماتے ہیں کہ 'سیالکوٹ کا واقعہ قابل مذمت ہے لیکن ریاست اگر توہین رسالت اور توہین ختم نبوت کے ملزمان کے خلاف کارروائی نہیں کرے گی تو اس قسم کے واقعات تو ہوں گے'۔ دوسری طرف مفتی منیب کو اعتراض ہے کہ اس واقعے میں تحریک لبیک کا نام کیوں لیا جا رہا ہے۔ اس ملک کے رہنے والوں کے لئے یہ ردعمل نیا نہیں۔ دہشت گردی اور 'ہجوم کے انصاف' کے ان گنت واقعات میں مجرموں سے فکری اور سیاسی ہمدردیاں رکھنے والے عناصر ایک مشروط مذمتی بیان سے آغاز کرتے ہیں۔ کچھ وقفے کے بعد اسی واقعے میں سچی جھوٹی تفصیل کی مدد سے دھول اڑائی جاتی ہے اور پھر کسی مناسب وقت پر منافقانہ مذمت کا پردہ اٹھا کر ریاستی عملداری کی ایک اور اینٹ کھینچ لی جاتی ہے۔ شفیع الاعظم کے استدلال میں معمولی تبدیلی سے بات سمجھ آ جاتی ہے۔ 'ریاست کے پاس توپیں اور بندوقیں ہیں، مذہبی سیاست دانوں کے پاس اشتعال انگیزی کی طاقت ہے۔ صاحبان منبر و محراب اشتعال کے شعلوں کو بجھنے نہیں دیں گے'۔

حالیہ واقعات کے بعد تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ریاست نے اپنی قوت نافذہ سے بھی ہاتھ کھینچ لیا ہے۔ اوائل نومبر میں شہید ہونے والے پولیس اہلکاروں کے اہل خانہ سے کسی نے تعزیت کی زحمت تک نہیں کی جب کہ طاقت کے بل پر رہائی پانے والوں کے لئے حزب اقتدار اور اختلاف بغیر کسی تخصیص کے پھولوں کے گلدستے اٹھائے قطار اندر قطار حاضر ہوئے۔ ملتان کے راشد رحمن ایڈووکیٹ، ولی خان یونیورسٹی مردان کے مشال خان، صادق ایجرٹن کالج کے استاد خالد حمید اور خوشاب کے بینک منیجر عمران حنیف کے خون ناحق پر تو ریاست نے اتنا ردعمل بھی نہیں دیا تھا۔ پریانتھا کمارا سری لنکن شہری نہ ہوتے تو شاید یہ سانحہ بھی پولیس کی گمنام فائلوں میں دب جاتا آخر ہم نے ڈینیئل پرل قتل میں لاحاصل قانونی رسہ کشی دیکھ رکھی ہے۔

پریانتھا کمارا کا واقعہ ایک ایسے وقت میں پیش آیا جب ملکی معیشت نہایت مشکل حالات سے گزر رہی ہے۔ سیالکوٹ کے اہل جنوں اور ملک بھر میں ان کے ہمنواؤں سے توبات کرنا لاحاصل ہے۔ آپ سے عرض کی جا سکتی ہے کہ پاکستان کے بیرونی قرضے 127 ارب ڈالر کو پہنچ گئے ہیں۔ ہماری معیشت کے کل حجم (280 ارب ڈالر) کو دیکھتے ہوئے ہمارے لئے بیرونی قرض کے سود کی قسط ادا کرنا بھی مشکل ہو رہا ہے۔ کل ملکی محصولات بجٹ کی دو بڑی مدات کا احاطہ کرنے کے لئے بھی ناکافی ہیں۔ ملکی آبادی دنیا میں پانچویں نمبر پر ہے لیکن برامدات میں ہمارا نمبر 67 ہے۔ رواں مالی برس میں براہ راست بیرونی سرمایہ کاری ابھی تک صرف 238 ملین ڈالر ہے۔ سعودی عرب کی طرف سے "رکھوائے گئے" چار فیصد سود پر 3 ارب ڈالر کی شرائط آپ نے دیکھ لی ہوں گی۔ لندن میں بیٹھے گورنر پنجاب چوہدری سرور آئی ایم ایف کے چھ ارب ڈالر کا کچا چٹھا بیان کر رہے ہیں۔ ایف ٹیف کی گرے لسٹ سے اب تک 50 ارب ڈالر کا نقصان ہو چکا اور حالیہ واقعات کے بعد آئندہ اجلاس بھی اچھی خبر نہیں لائے گا۔ 1190 ڈالر کی فی کس آمدنی کے ساتھ ہم دنیا میں 181 نمبر پر ہیں اور آئندہ ہفتے منی بجٹ کے ہمراہ مہنگائی کا ایک طوفان نمودار ہو گا۔

اس اندھے کنویں سے معیشت کو کیسے باہر نکالا جائے۔ بیرونی سرمایہ کاری بڑھائی جائے اور برآمدات میں اضافہ کیا جائے۔ سیالکوٹ جیسے واقعات سے بیرونی سرمایہ کار کا اعتماد کیسے بحال ہو گا؟ اور برآمدات میں ہم کب تک بستر کی چادریں بیچتے رہیں گے۔ یہ خبر تو آپ نے جان لی ہو گی کہ سیلیکون ویلی میں سائبر دنیا کی تمام اہم ترین کمپنیوں پر بھارتی شہری سربراہ بن گئے۔ بھارت نے انسانی سرمائے میں سرمایہ کاری کا سفر 30 برس پہلے شروع کیا تھا۔ ہم ان دنوں اپنی نوجوان نسل کو جنون کے انجکشن لگا رہے تھے۔ محترم نجم سیٹھی کے مطابق آرمی چیف جنرل قمر جاوید باجوہ 'جیو اسٹریٹیجک' کی بجائے 'جیو اکنامکس' کی پالیسی تجویز کر رہے ہیں مگر حکومت اس کے سیاسی ردعمل سے خائف ہے۔ ظالمو، آرمی چیف کی باقی باتیں آنکھیں بند کر کے مانتے ہو، اس عقل کی بات پر بھی توجہ دے لو۔ 'جیو اکنامکس' محض معیشت کا معاملہ نہیں، اس کے لئے خارجہ پالیسی پر نظر ثانی کرنا ہو گی، بامعنی نظام تعلیم میں سرمایہ کاری کرنا ہو گی۔ نیز یہ کہ معیشت خلا میں ترقی نہیں کرتی، اس کے لئے سیاسی استحکام اور ریاستی شفافیت کی ضرورت پڑتی ہے۔

ٹھیک 40 برس قبل ہم نے قلیل مدتی مقاصد کے لئے لسانی اور فرقہ وارانہ تنظیمیں کھڑی کی تھیں۔ نتیجہ دیکھ لیا؟ معاشی بدحالی، سیاسی انحطاط اور قومی وقار کی بربادی۔ ابھی وقت ہے کہ ملک کو مذہبی اشتعال کی کیفیت سے نجات دلا کر معیشت، پیداوار اور تعلیم کی راستے پر گامزن کیا جائے۔ یہ سفر طویل سہی لیکن معاشی ترقی کا کوئی شارٹ کٹ نہیں ہوتا۔

❁❁❁

لاہور انٹرنیشنل بین الاقوامی ترجمان ہے۔

ملک کی سیاسی، سماجی، مذہبی، ادبی، معاشرتی اور ثقافتی صورتحال کا تجزیہ تعلیم و تدریس و تربیت سے متعلق اہم مضامین کا آئینہ دار ہے۔

(ادارہ لاہور انٹرنیشنل لندن)

Lahore International Magazine

@lahoreintl

@lahoreintl

lahoreinternational

lahoreinternational

lahoreintl

+447940077825

+447940077825

lahoreintlondon@gmail.com

ضروری ادارتی نوٹ

نوٹ فرمالیں ادارتی نوٹ مضمون کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے۔ مصنف کی رائے، خیال، اپنا ہوتا ہے ضروری نہیں مصنف سے ادارہ متفق ہو اسی لیے بعض مضامین پر ادارتی نوٹ دیا جاتا ہے اور ایڈٹ بھی کیا جاتا ہے علاوہ ازیں یہ بھی نوٹ فرمالیں آن لائن ویب سائٹ اور رسالے میں شائع شدہ مواد کاپی رائٹ ہیں۔ بلا اجازت آرٹیکل شائع کرنا کاپی رائٹس قوانین کی خلاف ورزی اور جرم ہے کچھ احباب ایسا کر رہے ہیں انکو متنبہ کیا جارہا ہے۔

ضروری اعلان

ادارہ کے مالی حالات کے پیش نظر اور اس کو جاری رکھنے اور مزید بہتر ترقی دینے کی خاطر "ماہنامہ لاہور انٹرنیشنل" اور خواتین ڈائجسٹ "آبگینے" ملا ہور رسالہ ہر دو زبانوں اردو اور انگریزی میں لندن سے شائع ہوتے ہیں۔ ان تینوں رسالوں کو ادارہ اپنی ذاتی مالی حیثیت کے مطابق کئی سالوں سے جاری رکھے ہوئے ہے۔ دنیا کے تمام قارئین کے لئے یہ ایک معیاری اور پسندیدہ رسالے ہیں۔ ان کا خاص مقصد معاشرہ کی بہتر اصلاح، سچی کھری صحافت اور اسلام کی ترقی کے لئے یہ ایک تبلیغی کوشش ہے۔ یاد رہے ایسے اخبارات و رسائل کو جاری رکھنے کے لئے ایک بڑا ادارہ یا بزنس مین یا اشتہارات کی ضرورت ہوتی ہے جو ہمیں میسر نہیں۔

آپ تمام سے عاجزانہ درخواست ہے کہ اس کی ماہانہ مالی مدد فرما کر اس کار خیر میں اپنا حصہ ڈالئے۔ آپکی یہ معمولی رقم ہماری ہمت افزائی اور ترقی کا باعث ہوگی۔ آپ اپنی رقم درج ذیل بنک میں جمع کرواسکتے ہیں۔ اللہ تعالی آپ کا حامی و ناصر ہو۔

Bank Name:
Lloyds Bank PLC
Account Name:
Lahore International LTD
Account No:
42534160
Sort Code:
30-96-26
IBAN: GB89Loyd
3096242534160

❁❁❁

بے دماغ و بد دماغ سیاست

تحریر: وسعت اللہ خان

اعلیٰ دماغ مغربی ممالک کی کووڈ سے نمٹنے کی حکمت عملی سے اس تاثر کو مزید تقویت مل رہی ہے کہ کووڈ کا متاثر بظاہر صحت یاب ہوجائے تب بھی اثرات جسم اور ذہن کے مختلف افعال پر عرصے تک غالب رہتے ہیں اور ان سے چھٹکارا رفتہ رفتہ ہی ممکن ہے۔

اس تناظر میں مغربی بالخصوص یورپی دنیا کی ذہنی کیفیت کا اندازہ یوں لگایا جاسکتا ہے کہ وہ کووڈ کی نئی قسم اومیکرون سے بچنے کے لیے اپنی بری، بحری اور فضائی سرحدیں تو بند کر رہے ہیں مگر زائد از ضرورت کووڈ ویکسین ذخیرے کو ایکسپائر ہونے سے پہلے پہلے دیگر ضرورت مند انسانیت کو عطیہ کرنے کے بجائے اسے کروڑوں کی تعداد میں ضائع کرنا زیادہ بہتر سمجھ رہے ہیں۔ ان ممالک کی قیادت یہ بنیادی نکتہ بھی سمجھنے سے بظاہر قاصر ہو چکی ہے کہ جب تک پوری دنیا محفوظ نہیں ہوگی تب تک پابندیوں کی اونچی اونچی دیواریں کسی بھی خطے کو وائرس سے محفوظ نہیں رکھ سکیں گی۔ مغربی ممالک سرحدوں کو بند کرنے، پروازوں کو محدود کرنے اور لاک ڈاؤن کی قیمت پر کھربوں ڈالر کا معاشی خسارہ برداشت کرنے پر تو آمادہ ہیں مگر غریب امیر کے فرق کو بالائے طاق رکھ کے عالمی ویکسینیشن کے لیے آستینیں چڑھانے اور صرف چند ارب ڈالر خرچ کر کے اپنی معیشت کو کووڈ سے مستقل محفوظ کرنے کا ہدف حاصل کرنے کے بارے میں سوچنے سے معذور ہیں۔ چلیے مان لیا کہ آپ کسی بھی وجہ سے اپنے اضافی ویکسین ذخیرے پر سانپ بن کر بیٹھے ہیں۔ ظاہر ہے آپ نے اس ذخیرے کو خریدا ہے یہ آپ کی ملکیت ہے۔ اب آپ اسے استعمال کریں یا سمندر میں پھینکیں۔

مگر جب سو سے زائد ممالک بشمول اقوام متحدہ اور عالمی ادارہ صحت گزشتہ ایک برس سے مسلسل مطالبہ کر رہے ہیں کہ مغربی حکومتیں ویکسین ساز کمپنیوں پر انٹلیکچوئل کاپی رائٹس قوانین سے عارضی دستبرداری کے لیے دباؤ ڈالیں تاکہ اس انہونی عالمی وبا کا تیز رفتاری سے مقابلہ کیا جاسکے تب برطانیہ اور یورپی یونین (بالخصوص جرمنی، سوئٹزرلینڈ، برطانیہ) اس ایمرجنسی سے نمٹنے کے لیے لبیک کہنے کے بجائے دواساز کمپنیوں کے وکیل بن جاتے ہیں کہ وہ نجی شعبے کو کاپی رائٹس سے دستبرداری پر ایک حد سے زیادہ مجبور نہیں کرسکتے۔ اس بابت عالمی تجارتی ادارے (ڈبلیو ٹی او) کے سامنے چونسٹھ ممالک کی درخواست گزشتہ ایک برس سے پڑی ہے۔ مگر جن ممالک کی دواساز کمپنیاں ویکسین تیار کر رہی ہیں ان کی حکومتوں کے لیے انسانیت کو درپیش بحران کے مقابلے میں چند دواساز کمپنیوں کا منافع مقدم ہے۔ اسی لیے ڈبلیو ٹی او کی رکنیت کے باوجود یہ حکومتیں ہاں اور نہ کے درمیان نہ صرف خود لٹک رہی ہیں بلکہ باقی دنیا کو بھی لٹکا رکھا ہے۔ ننگے پن کا اندازہ اس سے بھی ہوسکتا ہے کہ خود ویکسین ساز کمپنیاں کاروباری رقابت میں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے اور زیادہ سے زیادہ بزنس ہتھیانے کی دوڑ میں ایک دوسرے کی ویکسین کی افادیت پر اپنی اپنی پسندیدہ اجرتی ریسرچ لابیوں کی جانب سے وقتاً فوقتاً "تازہ ترین تحقیق" کے نام پر جاری رپورٹوں اور آنکڑوں کو اچھالتی ہیں تاکہ حکومتیں اور عام لوگ کنفیوز ہوں اور ایک ویکسین پر اٹھنے والے سوالوں کے جب تک تسلی بخش جوابات تلاش کریں تب تک دوسری کمپنی زیر تفتیش کمپنی کا بزنس لے اڑے۔ ویکسین کی یہ جنگ محض کمپنیوں تک محدود نہیں۔ ریاستیں بھی ویکسین سازی کے کاروبار کو تحفظ دینے کے لیے ایک دوسرے سے مصروف پیکار ہیں۔ جیسے متعدد مغربی ممالک اور ان کی ہاں میں ہاں ملانے والے دوسری دنیا کے چند متوسط ممالک چینی، روسی، بھارتی یا دیگر غیر مغربی ویکسینز کی افادیت تسلیم نہیں کرتے اور اصرار کرتے ہیں کہ مسافر اور مقامی شہری صرف وہی ویکسینز لگوائیں جو مغربی کمپنیاں بناتی ہیں۔ حالانکہ عالمی ادارہ صحت کی منظور شدہ ویکسین فہرست میں غیر مغربی ویکسینز نہ صرف شامل ہیں بلکہ انھیں محفوظ اور موثر بھی قرار دیا گیا ہے۔

گویا مغرب نہ تو ویکسین کا فالتو ذخیرہ ضرورت مندوں کو عطیہ کرنے پر آمادہ ہے، نہ ہی ویکسین کی ترقی پذیر دنیا میں مقامی تیاری کی خاطر کاپی رائٹس قوانین کی عارضی معطلی میں تعاون کر رہا ہے سرمایہ دارانہ نظریے پر کاربند ہوتے ہوئے بھی مغرب کو یہ پہلو تنگ نہیں کر رہا کہ منڈی بیمار ہوگی تو مال کون خریدے گا اور مال نہ بکا تو خود مغربی معیشتوں کا کیا حال ہوگا۔ اور اگر حال دگرگوں ہوا تو چین کو ہدف بنا کر نئی سرد جنگ کے ایجاد کردہ خوف کا مستقبل کیا ہوگا؟ اس بوالعجبیانہ تضاد کا علاج کوئی مہان ماہر نفسیات ہی بتا سکتا ہے۔

اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل انتونیو گوتریس اور عالمی ادارہ صحت کے سربراہ ٹیڈروس ایڈہنوم کا موقف ہے کہ کووڈ کی وبا سے نمٹنے کی کوششوں میں گہری عدم مساوات کا مسئلہ تب ہی حل ہوسکتا ہے جب اسے بھی بنیادی انسانی حقوق کی عینک سے دیکھا جائے۔

مگر دونوں اعلیٰ عالمی عہدیدار یہ بھی جانتے ہیں کہ مغرب چونکہ گرم و سرد جنگ کا برس ہا برس سے چشیدہ ہے۔ لہٰذا ذہنی عینک بھی وہی ہے جو اس نے دوسری عالمی جنگ کے بعد سے نہیں اتاری۔ مغرب کے لیے آج کا چین اور روس کووڈ سے بڑا خطرہ ہے۔ کووڈ اگر جوہری ہتھیاروں سے لیس ہوتا یا کوئی خود کش بمبار ہوتا تب شاید دنیا کو اس خطرے سے بچانے کے نام پر مغرب کب کا دوڑ پڑتا۔

مغرب کووڈ سے پہنچنے والے معاشی خسارے سے اتنا ہولق نہیں جتنا بیلٹ اینڈ روڈ منصوبے سے ہے۔ اس منصوبے کے مقابلے کے لیے مغرب نے تین سو ارب یورو کے فنڈ کے قیام کا اعلان بھی کیا ہے تاکہ ترقی پذیر ممالک کو چین کے قرضوں کے جال والی سفارت کاری سے بچاتے ہوئے انھیں انفرااسٹرکچر منصوبوں کو کھڑا کرنے میں رعایتی نرخوں پر مدد فراہم کی جائے۔ مگر مغرب چین کی کووڈ ڈپلومیسی کے مقابلے میں تیسری دنیا کو کووڈ ویکسین سے بھر دینے یا ویکسین کی تیاری کے لیے انٹلیکچوئل کاپی رائٹس معطل کروانے کے کام پر ہرگز آمادہ نہیں۔ اگر یہی اعلیٰ دماغ سفارت کاری ہے تو پھر بین الاقوامی بد دماغی اور بے دماغی کیا ہے؟

بارود بھرے لوگ

تحریر: جمیل احمد بٹ

3 دسمبر کو سیالکوٹ میں ایک انسانی جان کا جس ظلم و بربریت سے زیاں کیا گیا ہے۔اس سے مذہب کے نام پر خون بہانے کی ملکی تاریخ میں ایک اور سیاہ باب کا افسوسناک اضافہ ہوا ہے۔

جیسے بارودی سرنگیں: مشتعل ہو کر کئی سو افراد کا ایک نہتے فرد پر یوں حملہ آور ہونا اور کسی کا اسے روکنے کی کوشش نہ کرنا اس غیض وغضب کا مظہر ہے جس نے عوام الناس کے دلوں کو کئی دہائیوں سے دی جانے والی نفرت،عدم رواداری،عدم برداشت کی مسلسل تعلیم، رویوں اور حمایت نے بھر رکھا ہے۔بارود بھرے ان لوگوں کو پھٹنے کے لئے کوئی بھی بہانہ کافی ہوتا ہے۔جیسے وہ بارودی سرنگیں جو دشمن کو نقصان پہنچانے کی غرض سے بچھائی جاتی ہیں اور نظروں سے اوجھل ہونے کے باوجود،وجود رکھتی ہیں اور کسی ٹھوکر پر پھٹ کر نقصان کر گزرتی ہیں۔

تحت الثریٰ کی طرف: اس دین سے تعلق کے دعوے کے ساتھ جس نے ایک انسان کے ناحق قتل کو پوری انسانیت کا قتل قرار دیا اور جس نے حوصلہ، برداشت اور رواداری کی بے مثل تعلیم دی،اور اس عظیم ترین وجود ﷺ کے نام پر جو سب جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجے گئے اور جنہوں نے خود مذہبی رواداری اور برداشت کا حیرت انگیز اسوہ دکھایا حتیٰ کہ غیر مذاہب کے جنازوں کا احترام بھی عملاً کر کے دکھایا۔آج گرتے گرتے گویا تحت الثریٰ کو پہنچ جانا ایک عبرت ناک تاریخ ہے۔

آگ کا عذاب: قرآن کریم میں ۱۴۵ مقامات پر نار کا ذکر ہے جن میں سے بیشتر جہنم کے حوالے سے ہیں۔یہ معاملہ تو خیر بعد کا ہے۔لیکن اپنے وجودوں میں بارود بھرے جو لوگ یہاں بھی ہر دم اپنے آپ کو غیض وغضب کی آگ میں جلاتے رہتے ہیں۔کیا وہ اسی دنیا میں عذابِ جہنم سے حصہ تو نہیں پا رہے؟ یہ مقامِ خوف ہے اور اسی لئے مقامِ فکر۔

ذمہ داراں: اس انجام تک پہنچانے میں دین سکھانے والے، حکومت کرنے والے، قانون بنانے والے، فیصلے کرنے والے، میڈیا والے، خاموش رہ کر تماشا دیکھنے والے اور خود عقل وخرد کو تج کر ان مفاد پرست ٹولوں کے ہاتھوں کھلونا بننے والے سب یکساں ذمہ دار ہیں۔ان سب نے اپنے طور پر بھی اور ایک دوسرے کی مدد کر کے بھی اس زوال میں حصہ ڈالا ہے۔

پہلے ذمہ دار۔مولوی: جیسا کہ پہلے ہی باخبر کر دیا گیا تھا کہ بعض دین سکھانے والے انسانی سطح سے پست ہو جائیں گے۔ایسا ہی ظہور میں آیا۔اور اس گروہ نے اپنی اپنی جتھہ بندی اور اس کے تحت دنیا کمانے کے لئے دوسرے عقیدے والوں کے خلاف نفرت اور عدم برداشت کی تعلیم دی اور دے رہے ہیں۔اکھٹے عبادت نہ کرنے اور سماجی تعلقات نہ رکھنے کی ابتدا نے واجب القتل کے فتووں تک پہنچایا اور اب 'سر تن سے جدا' کا نعرہ دیا۔مستشرقین کے طریق پر چلتے ہوئے غیر مستند روایات کے سہارے، محض اپنی اذیت پسندی کی تسکین کے لئے،خون ریزی کا یہ درس دین کی امن وسلامتی کی ضامن تعلیم کے صریحاً برعکس ہے۔

دوسرے ذمہ دار۔حکومتیں: وہ سب حکومتیں جن کا حصولِ اقتدار یا اس کے جاری رکھنے کے لئے مذہب کا استعمال وتیرہ رہا ہے۔وہ جنہوں نے اس غرض سے مقننہ کو استعمال کر کے آئین میں دوسری ترمیم کی۔اور وہ جنہوں نے اس کے تابع بعد میں مزید ایسے قوانین بنائے جنہوں نے نفرت انگیزی اور تعصب کے ان شعلوں کو اور بھی ہوا دی۔جنہوں نے اسی غرض سے مذہب کو سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرنے والے علماء کی سرپرستی کی۔بلکہ از خود بھی مفید مطلب مذہبی گروہ بنائے،ان کی معاونت کی،ان کی غیر قانونی سرگرمیوں سے صرفِ نظر کئے رکھا اور حسب ضرورت انہیں استعمال کیا۔جس کے ایک بدنتیجہ میں ملک لمبے عرصہ تک ایک بھیانک دہشت گردی کا شکار رہا ہے۔یہ سرپرستانہ رویہ مجموعی طور پر نفرت انگیزی کی مہم کے پھیلاؤ کا سبب اور اس کا مقابلہ کرنے کے لئے حکومتی ارادوں اور موثر کاروائی میں سب سے بڑی روک ہے۔

تیسرے ذمہ دار۔مقننہ: وہ سب اسمبلیاں جن کے ارکان گو بعد میں وائٹ پیپرز اور احتسابی عمل کے کردار رہے لیکن جنہوں نے اپنے دنیوی مفاد کی خاطر وقت کے حکام کے اشاروں پر اپنی حدود سے تجاوز کرتے ہوئے ایسی قانون سازی کی۔جو ایک طرف دینی تعلیم کے سراسر برعکس اور مروجہ بین الاقوامی اصولوں سے متصادم تھی وہیں اس نے مذہبی منافرت کو قانون کا درجہ دے دیا۔اور جنہوں نے ایسے قوانین بنائے جانے کو نہ روکا جن کے تحت پورے ملک میں سے صرف ایک جماعت کی علیحدہ ووٹر لسٹ بنائی جاتی ہے

اور بیشتر سرکاری دستاویزات جیسے شناختی کارڈ فارم، پاسپورٹ فارم، پاسپورٹ، تعلیمی اداروں کے داخلہ فارم، اعلیٰ ملازمتوں کے لئے درخواست فارم، ووٹر لسٹ اور اب نکاح ناموں میں بلا ضرورت مذہب کا خانہ شامل کیا گیا ہے۔ جبکہ ان سب کا مقصد کھلے طور پر صرف تفریق اور نفرت کا کاروبار کرنے والوں کے ہاتھ مضبوط کرنا اور آبادی کے ایک حصہ کا استحصال ہے۔

چوتھے ذمہ دار۔ عدلیہ: وہ سب جو انصاف کی کرسی پر بیٹھے تھے لیکن جنہوں نے انصاف اور قانون کی دھجیاں بکھیرتے ہوئے ان تفریقی قوانین کو نہ صرف جائز رکھا بلکہ حسب استطاعت ان میں ویسی ہی ایزادیاں بھی تجویز کیں۔ پھر وہ جنہوں نے نفرت انگیز جرائم کرنے والوں کی نہ صرف گرفت نہیں کی بلکہ انہیں آزاد بھی کیا۔ اور وہ بھی جنہوں نے ناکردہ جرائم کی پاداش میں گرفتاروں کی دادرسی نہ کی اور بسا اوقات ضمانت تک نہ لی۔ اور وہ بھی جنہوں نے ان قوانین کے بے جا استعمال سے کی جانے والی حق تلفیوں کو روا رکھا یا ایسے مقدمات کی ارادتاً شنوائی نہ کی۔ اور یوں ان سب نفرت کا پرچار کرنے والے قانون شکنوں کی حوصلہ افزائی کی۔ کیا تعجب ہے کہ پاکستان کی عدلیہ دنیا بھر کے عدالتی نظاموں میں درجہٗ آخر پر شمار ہوتی ہے۔

پانچویں ذمہ دار۔ میڈیا: چند مستثنیات کو چھوڑ کر وہ سب پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا جس نے نفرت انگیزی کی مہم میں جھوٹ بول کر یا معمولی واقعات کو بڑھا چڑھا کر غلط رنگ دیا اور دوسری طرف اس مہم کے شکار چھوٹی جماعتوں کے خلاف ظلم و زیادتی کے واقعات سے عمداً آنکھیں بند کئے رکھیں اور ان خبروں کا مکمل بائیکاٹ کیا۔ حتیٰ کی ان کی جاری کردہ پریس ریلیزز کو بھی شائع نہ کیا اور یوں عملاً اس مہم کے موئید و مددگار بنے رہے۔ نیز وہ سب میڈیا جس نے اس نفرت انگیزی کی مہم کے توڑ کے لئے اپنے پیشہ ورانہ فرض کی ادائیگی میں عوام کو باہم محبت اور بھائی چارہ کا درس نہ دیا اور تنگ نظری سے عقیدہ کی بنیاد پر تفریق کرنے اور نفرت پھیلانے کی مذمت نہ کی۔

چھٹے ذمہ دار۔ خاموش تماشائی: ملک کے شرفاء کی وہ بھاری اکثریت جس نے بزدلی سے منافقت کی راہ اپنائے رکھی۔ جنہوں نے نجی محفلوں اور ڈرائنگ روم مجالس میں انسانی حقوق اور بھائی چارے کی خوب وکالت کی لیکن باہر زبان بند رکھی۔ وہ ان غلط کاریوں میں براہ راست عملاً شریک تو نہ ہوئے لیکن ان کے خلاف آواز اٹھائی نہ مخالف ردعمل ظاہر کیا اور یوں ان کی خاموش حمایت کی۔ اور اس غلط تاثر کو ہوا دی کہ گویا سارا ملک ہی نفرت انگیزی کی اس مہم میں شریک ہے۔

ساتویں ذمہ دار۔ عوام الناس: وہ سب عام لوگ جو کالانعام بنے رہے۔ جنہوں نے مخالف پروپاگنڈے کو صرف سن کر سچ مان لیا۔ ان کے عقیدے کے صحیح یا غلط ہونے کو جانچا نہ ان کے خلاف سنی سنائی باتوں کو پرکھا۔ اور نہ اس مشاہدہ کو مقدم کیا جو دوسرے عقیدے والے لوگوں کے پڑوس میں رہ کر، ساتھ کھیل کر، بچپن سے ساتھ بڑے ہو کر، اسکول اور کالج میں اکٹھے تعلیم پا کر، ملازمتوں اور کاروبار میں اکٹھے وقت گزار کر، رشتہ داریاں رکھ کر وہ حاصل کر چکے تھے۔ غرض اپنی عقل کو استعمال نہیں کیا۔ اور آنکھیں بند کر کے روحانی نابیناؤں کے پیچھے چلتے رہے۔ اور جب مولوی نے جو کہا اس پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ سلام دعا ترک کر دیا۔ میل ملاقات چھوڑ دیا۔ لین دین اور کاروبار میں الگ کر دیا۔ اور اس بات کو بھول گئے کہ اس حوالے سے پیارے آقا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا کیا اسوہ تھا۔

پستی سے نکلنے کی راہ: اس پستی سے نجات کی راہ صرف غلطیوں کی درستگی ہے۔ اس میں کلیدی کردار حکومت کا ہے۔ اسے جہاں خود کو مذہب سے علیحدہ کر کے اپنے ان بنیادی فرائض کو ادا کرنا ہوگا کہ بلا کسی تفریق کے اس کی رٹ قائم ہو۔ بلا استثنا سب فسادی کیفر کردار تک پہنچیں۔ حکومتی مناصب صرف صلاحیت کی بنیاد پر تفویض ہوں۔ ہر شہری کو بلا لحاظ مذہب و عقیدہ اس کے جملہ حقوق حاصل ہوں۔ وہیں اسے یہ بھی یقینی بنانا ہوگا کہ اسمبلیاں ان سب قوانین کو قلم زد کریں جو مسلمہ بنیادی انسانی حقوق کی نفی کرتے ہیں۔ یا جو ملک کے شہریوں کے درمیان تفریق کرتے ہیں۔ عدالتیں بلا لحاظ عقیدہ سب کو جلد انصاف مہیا کریں اور میڈیا صحافتی اصولوں کے تابع بلا لگی لپٹی اور بلا تفریق آگہی دے۔ حکومتی سطح پر مثبت پیش رفت شہریوں کے لئے بھی درست راہ متعین کرے گی اور رفتہ رفتہ ان میں اختلاف عقیدہ کی برداشت کا حوصلہ اور گفتگو سے معاملات کے حل کا رجحان پیدا ہوگا۔ اور نفرتیں دور ہوں گی۔ یہ کام جتنی جلد ہوگا موجود اندھیرا اتنی جلد دور ہوگا۔

❁❁❁

اشتہارات کے لیے

رسالہ ماہنامہ لاہور انٹرنیشنل کو پاکستان اور دنیا بھر سے لاکھوں قارئین مطالعہ کرتے ہیں یہ پرنٹ کے علاوہ آن لائن ویب سائٹ پر بھی موجود ہے۔ آپ دنیا کے کسی بھی ملک میں ہوں اپنے اشتہارات شائع کروا کر مقامی طور پر اپنی کمپنی کی تشہیر، مشہوریت کر سکتے ہیں معلومات کیلئے آپ ہمارے نمائندگان اور ادارہ سے براہ راست رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں لاہور انٹرنیشنل youTube چینل کا بھی آغاز ہو چکا ہے۔ تمام معلومات اس رسالے میں موجود ہیں شکریہ۔

http:www.youtube.com/channel/
UCwM31ueU85MOWeH0UBFhMYw

عدلیہ کا حصہ بننے کی بجائے چوپایہ پالتیں اور اُپلے تھونپتیں

سلام آباد (انصار عباسی) پنجاب سے تعلق رکھنے والی خاتون ایڈیشنل ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج ڈاکٹر ساجدہ احمد نے چیف جسٹس پاکستان اور چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ کو لکھے ایک کھلے خط میں کہا ہے کہ عدلیہ کا حصہ بننے کی بجائے بہتر یہ ہوتا کہ وہ اپنے گاؤں میں چوپایہ پالتیں اور اُپلے تھونپتیں؛ کیونکہ عدلیہ کا حصہ بننے کی وجہ سے انہیں ''نام نہاد'' وکلاء کی گندی گالیاں اور توہین برداشت کرنا پڑتی ہے۔ پنجاب میں ماتحت عدالتوں کے ججوں بشمول خواتین کے ساتھ کیے جانے والے سلوک سے مایوس اس خاتون جج نے یہ تک کہا ہے کہ اگر اسلام میں خودکشی حرام نہ ہوتی تو وہ خود کو سپریم کورٹ کی عمارت کے سامنے خودکشی کرلیتیں کیونکہ جج کی حیثیت سے انہیں اور ان کے ساتھیوں کو روزانہ کی بنیاد پر گالیوں، توہین اور ہراسگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انہوں نے افسوس کا اظہار کیا ہے کہ ان کے سینئرز نے ضلعی عدلیہ کے ججوں کو اس توہین سے بچانے کیلئے کچھ نہیں کیا۔ ڈاکٹر ساجدہ احمد وہی با ہمت خاتون ہیں جنہوں نے عدلیہ تحریک میں آزاد عدلیہ کے حق میں کھل کر ساتھ دیا تھا جس کی وجہ سے انہیں اس وقت کے چیف جسٹس لاہور ہائیکورٹ کے غصے کا سامنا کرنا پڑا تھا اور انہیں بھکر ٹرانسفر کر دیا گیا تھا۔ فی الوقت وہ فتح جنگ اٹک میں ایڈیشنل سیشن اینڈ ڈسٹرکٹ جج ہیں۔ ''اگر مجھے عدالت میں خاتون جج کی حیثیت سے نام نہاد وکلاء سے توہین اور گندی گالیاں برداشت کرنا ہیں تو میرے لیے بہتر تھا کہ میں اپنی زندگی کے پچیس سال اعلیٰ تعلیم کے حصول میں لگانے کی بجائے عام پاکستانی لڑکیوں کی طرح بیس سال کی دہائی میں شادی کرلیتی اور اپنے والدین کا قیمتی وقت اور پیسہ پندرہ سال تک اسلام آباد میں اعلیٰ تعلیم کے حصول پر برباد نہ کرتی۔ اچھا ہوتا کہ میں چوپایے کو چرانے کا کام کرتی، اپلے تھوپتی، اپنی کاشتکار فیملی کی مدد کرتی اور اسلام آباد کی روشنیوں کی بجائے پریشانیوں اور مصائب سے پاک زندگی گزارتی۔'' انہوں نے کہا، ''اس عظیم پیشے کو غیر پیشہ ور افراد اور کالی بھیڑوں نے ہائی جیک کرلیا ہے۔ وکلاء کے عدالتوں اور پریزائڈنگ افسر کی موجودگی میں عام عوام، پولیس والوں پر زبانی و جسمانی حملے معمول بن چکے ہیں، یہ سب کچھ آپ کی ناک کے نیچے ہو رہا ہے۔'' انہوں نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا، ''بدقسمتی ہے کہ ہم وکلاء تحریک کے ثمرات کا فائدہ اٹھانے میں ناکام رہے، قانون کی بالادستی کے عظیم مقصد کے حصول میں ناکام رہے اور ہمارا تشخص اس وقت دنیا نے خراب ہوتے دیکھا جب لاہور بار ایسوسی ایشن کے وکلاء نے پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیولوجی (پی آئی سی) پر اس وقت حملہ کیا جب وہاں دل کے مریضوں کی جان بچائی جا رہی تھی۔'' انہوں نے کہا کہ اگر ضلعی عدلیہ کی شکایات کا ازالہ نہ کیا گیا تو ججوں کو سیکریٹری جنرل اقوام متحدہ، یورپی کمیشن برائے ہیومن رائٹس، ایمنسٹی انٹرنیشنل ہیومن رائٹس واچ کمیشن، انٹرنیشنل ایسوسی ایشن فار مین اینڈ ویمن ججز، انٹرنیشنل بار ایسوسی ایشن آف لائرز میں درخواست دائر کرنا ہوگی جس میں پاکستان میں شر پسند وکلا کی کرتوتوں اور ججوں کیخلاف ان کی بدتمیزیوں کو نمایاں کیا جائے گا جو روزانہ کی بنیاد پر یہاں ہو رہا ہے بالخصوص پنجاب کی ضلعی عدالتوں میں۔ انہوں نے کہا کہ پنجاب میں ضلعی عدالتوں کا اصول ہے ''عزت نہیں تو کام نہیں'' انہوں نے کہا کہ جج صاحبان سب کو انصاف فراہم کرتے ہیں لیکن انصاف فراہم کرنے والوں کو کون انصاف دے گا۔ انہوں نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا کہ ضلعی بارز میں موجود گندے اور گھناؤنے عناصر اور غیر پیشہ ور وکلاء کیخلاف تعزیراتِ پاکستان کے سیکشن 228/ کے تحت اور توہین عدالت کی کارروائی کیوں نہیں کی جا رہی۔ انہوں نے اپنے اسی سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ضلعی عدلیہ کے ججز جانتے ہیں کہ ان کا مسئلہ حل نہیں ہوگا بلکہ اس کی بجائے ان کے سینئر عہدیداران کی سرزنش کریں گے کہ آپ دانشمندی کے ساتھ مسائل کیوں نہیں حل کرتے یا پھر آپ کو اپنی عدالت سنبھالنا نہیں آتی؟ وغیرہ۔ سوال یہ ہے کہ ایسے غیر پیشہ ور وکلاء کیخلاف ریفرنسز اور شکایات پنجاب بار کونسل اور پاکستان بار کونسلز کو کیوں نہیں بھیجی جاتیں کہ ان کا لائسنس پریزائڈنگ افسر کے ساتھ روزانہ کی بنیاد پر بدتمیزی اور بدسلوکی کا جائزہ لیتے ہوئے عارضی یا مستقل طور پر معطل کیا جاسکے۔ انہوں نے کہا، جناب، یہ جرم عوام کیخلاف ہے کہ عدالت میں کسی جج کو گالی دی جائے، اسے دھمکایا جائے یا اسے عدالتوں میں مارا پیٹا جائے، تو آخر ایسے گھمنڈی وکلاء کیخلاف پٹیشن صوبائی اور وفاقی محتسب میں کیوں نہ بھیجی جائے اور انہیں بتایا جائے کہ مقامِ کار پر ہراسگی کا کیس ہے۔ انہوں نے کہا کہ اگر پیشہ ور وکلاء ایسے غیر پیشہ ور وکلاء کے دباؤ میں ہیں تو آخر سالانہ انتخابات میں وہ انہیں ووٹ دیتے ہی کیوں ہیں۔ انہوں نے انکشاف کیا کہ حالیہ برسوں کے دوران پنجاب میں تقریباً ایک درجن سے زائد نوجوان، پرجوش ضلعی عدالتوں کے جج صاحبان کو ہلاک کیا جا چکا ہے لیکن کوئی بھی ان کی ہلاکت کی وجہ پر دھیان نہیں دیتا۔ نوجوان سینئر سول پاک پتن جج مسٹر بدیع الزماں کی تازہ ترین ہلاکت کا واقعہ بھی سب کے سامنے ہے، اس واقعے کی وضاحت سامنے آنا چاہئے کہ وہ اچانک برین ہیمرج کی وجہ سے کیوں انتقال کر گئے؟ اگر ہمیں اسی طرح وکلاء کی ڈانٹ ڈپٹ، گالیوں اور ذہنی و جسمانی ٹارچر کا سامنا کرنا ہے اور آپ ہمیں، ہمارے اور ہمارے خاندان کے وقار اور توقیر کو بچا نہیں سکتے تو ہم وہ تمام مراعات واپس کرنے کو تیار ہیں جو ہمیں دی گئی ہیں جیسا کہ گاڑی، لیپ ٹاپ، اضافی تنخواہ وغیرہ لیکن اس کی قیمت ہماری یا ہمارے خاندان کی عزت نہیں کیونکہ عدالتوں میں مرد و خواتین ججوں کو ہراساں کیا جاتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں مجبور ہوں، مایوس اور پریشان بھی کہ اپنی تعلیمی اسناد ایک ایک کرکے عزت مآب لاہور ہائی کورٹ کے سامنے نذر آتش کر دوں یا پھر احتجاجاً سپریم کورٹ کے سامنے تاکہ 23/ کروڑ عوام میں خواتین کو اتنا حوصلہ ملے کہ وہ آئیں اپنے جوش اور ایمان کے ساتھ کسی کی بہن، بیٹی یا بیوی یا ماں بن کر اپنے وقار اور تکریم کے ساتھ اس عظیم قوم کی خدمت اس پیشے میں رہتے ہوئے کرسکیں جس کی اب قدر نہیں رہی۔ ❁❁❁ (منقول)

شعبہ پاکستان

ایک آرائیں کی کہانی - زمانے کی زبانی

والد نے ان کا نام محمد لطیف رکھا وہ بڑے ہو کر چوہدری محمد لطیف ہو گئے لیکن دنیا انہیں "سی ایم لطیف" کے نام سے جانتی تھی وہ پاکستان کے پہلے وژنری انڈسٹریلسٹ تھے اور انڈسٹریلسٹ بھی ایسے کہ چین کے وزیر اعظم چو این لائی شام کے بادشاہ حافظ الاسد اور تھائی لینڈ کے بادشاہ ان کی فیکٹری دیکھنے کیلئے لاہور آتے تھے چو این لائی ان کی فیکٹری ان کے بزنس ماڈل اور ان کے انتظامی اصولوں کے باقاعدہ نقشے بنوا کر چین لے کر گئے اور وہاں اس ماڈل پر فیکٹریاں لگوائیں

سی ایم لطیف کی مہارت سے شام تھائی لینڈ ملائیشیا اور جرمنی تک نے فائدہ اٹھایا وہ حقیقتاً ایک وژنری بزنس مین تھے وہ مشرقی پنجاب کی تحصیل بٹالہ میں پیدا ہوئے والد مہر میران بخش آرائیں اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلانا چاہتے تھے لیکن وہ لطیف صاحب کے بچپن میں فوت ہو گئے لطیف صاحب نے والد کی خواہش کے مطابق اعلیٰ تعلیم حاصل کی یہ 1930ء میں مکینیکل انجینئر بنے اور تعلیم مکمل کرنے کے بعد انہوں نے دو کمروں اور ایک برآمدے میں اپنی پہلی مل لگائی یہ صابن بناتے تھے ان کے چھوٹے بھائی محمد صدیق چوہدری بھی ان کے ساتھ تھے صدیق صاحب نے بعد ازاں نیوی جوائن کی اور یہ قیام پاکستان کے بعد 1953ء سے 1959ء تک پاکستان نیوی کے پہلے مسلمان اور مقامی کمانڈر انچیف رہے لطیف اور صدیق دونوں نے دن رات کام کیا اور ان کی فیکٹری چل پڑی یہ ہندو اکثریتی علاقے میں مسلمانوں کی پہلی انڈسٹری تھی یہ صابن فیکٹری کے بعد لوہے کے کاروبار میں داخل ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے علاقے میں چھا گئے اور لاکھوں میں کھیلنے لگے پاکستان بنا تو ان کے پاس دو آپشن تھے یہ اپنے کاروبار کے ساتھ ہندوستان میں رہ جاتے یا یہ کاروبار زمین جائیداد اور بینک بیلنس کی قربانی دے کر پاکستان آجاتے سی ایم لطیف نے دوسرا آپشن پسند کیا یہ بٹالہ سے لاہور آ گئے لاہور اور بٹالہ کے درمیان 53 کلومیٹر کا فاصلہ ہے لیکن اگر حقیقی طور پر دیکھا جائے تو یہ دونوں شہر دو دنیاؤں کے فاصلے پر آباد ہیں

آزادی نے سی ایم لطیف کا سب کچھ لے لیا یہ بٹالہ سے خالی ہاتھ نکلے اور خالی ہاتھ لاہور پہنچے بٹالہ میں ان کی فیکٹریوں کا کیا سٹیٹس تھا؟ آپ اس کا اندازہ صرف اس حقیقت سے لگا لیجئے ہندوؤں اور سکھوں نے ان کی ملوں پر قبضہ کیا کاروبار کو آگے بڑھایا اور آج بٹالہ لوہے میں بھارتی پنجاب کا سب سے بڑا صنعتی زون ہے سی ایم لطیف بہرحال پاکستان آئے اور 1947ء میں نئے سرے سے کاروبار شروع کر دیا انہوں نے لاہور میں بٹالہ انجینئرنگ کمپنی کے نام سے ادارہ بنایا یہ ادارہ آنے والے دنوں میں "بیکو" کے نام سے مشہور ہوا

بیکو نے پاکستان میں صنعت کاری کی بنیاد رکھی لوگ زراعت سے صنعت کی طرف منتقل ہوئے اور ملک میں دھڑا دھڑ فیکٹریاں لگنے لگیں۔ سی ایم لطیف نے ملک میں بے شمار نئی چیزیں متعارف کرائیں یہ سائیکل سے لے کر جہازوں کے پرزے تک بناتے تھے بیکو گروپ یورپ سے لے کر چین اور جاپان تک مشہور تھا

جاپان اور چین کی حکومتیں اپنے لوگوں کو ٹریننگ کیلئے بیکو بھیجتی تھیں 1971ء میں پاکستان ٹوٹ گیا اور ذوالفقار علی بھٹو موجودہ پاکستان کے صدر بن گئے بھٹو نے 1972ء میں ملک کے تمام صنعتی گروپ قومیا لئے، یوں صدر کے ایک حکم سے ملک بھر کے تمام بڑے صنعت کار فٹ پاتھ پر آ گئے

آپ تصور کیجئے ایک شخص جس نے 1932ء میں بٹالہ میں کام شروع کیا اور وہ جب وہاں سیٹھ بنا تو اس کا سارا اثاثہ آزادی نے لوٹ لیا وہ لٹا پٹا پاکستان آیا اس نے دوبارہ کام شروع کیا

ایک ایک اینٹ رکھ کر ایسی عمارت کھڑی کی جسے دیکھنے کیلئے دنیا کے ان ملکوں کے حکمران آتے تھے جنہیں مستقبل میں "اکنامک پاورز" بننا تھا لیکن پھر ایک رات اس کا سارا اثاثہ اس ملک نے چھین لیا جس کیلئے اس نے 1947ء میں اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا آپ تصور کیجئے اس شخص کی ذہنی صورتحال کیا ہو گی؟ سی ایم لطیف حوصلہ ہار گئے وہ پاکستان سے نقل مکانی کر گئے وہ جرمنی گئے اور جرمنی کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں زندگی گزار دی انہوں نے دوبارہ کوئی کمپنی بنائی کوئی کاروبار کیا اور نہ ہی کوئی فیکٹری لگائی وہ طویل العمر تھے ان کا انتقال 2004ء میں 97 سال کی عمر میں ہوا وہ باقی زندگی صرف باغبانی کرتے رہے ان کا کہنا تھا۔ دنیا کا کوئی شخص مجھ سے پودے اور پھول نہیں چھین سکتا جنرل ضیاء الحق نے 1977ء میں انہیں بیکو واپس لینے کی درخواست کی لیکن سی ایم لطیف نے معذرت کر لی 1972ء میں جب بھٹو نے سی ایم لطیف سے بیکو چھینی تھی اس وقت اس فیکٹری میں چھ ہزار ملازمین تھے اور یہ اربوں روپے سالانہ کا کاروبار کرتی تھی لیکن یہ فیکٹری بعد ازاں زوال کا قبرستان بن گئی حکومت نے اس کا نام بیکو سے پیکو کر دیا تھا پیکو نے 1998ء تک اربوں روپے کا نقصان کیا۔ یہ ہر سال حکومت کا جی بھر کر خون چوستی تھی بیکو بادامی باغ کے پسماندہ علاقہ میں تھی اسکی وجہ سے یہ علاقہ کبھی پاکستانی صنعت کا لالہ زار ہوتا تھا اور دنیا بھر سے آنے والے سربراہان مملکت کو پاکستان کی ترقی دکھانے کیلئے خصوصی طور پر بادامی باغ لایا جاتا تھا لیکن حکومت کی ایک غلط پالیسی اور ہماری سماجی نفسیات میں موجود حسد اور خودکشی کے جذبے نے اس لالہ زار کو صنعت کا قبرستان بنا دیا اور لوگ نہ صرف بیکو کی اینٹیں تک اکھاڑ کر لے گئے بلکہ

انہوں نے بنیادوں اور چھتوں کا سریا تک نکال کر بیچ دیا اور یوں پاکستان کا سب سے بڑا وژنری صنعت کار اور ملک کی وہ صنعت جس نے جاپان اور چین کو صنعت کاری کا درس دیا تھا وہ تاریخ کا سیاہ باب بن کر رہ گئی آج حالت یہ ہے وہ لوگ جن کے لیڈر پاکستان سے صنعت کاری کے نقشے حاصل کرتے تھے وہ لوگ سی ایم لطیف کے ملک کو بلڈوزر سے لے کر ٹریکٹر اور ٹونٹی سے لے کر ہتھوڑی تک بیچتے ہیں اور سی ایم لطیف کی قوم یہ سارا سامان خرید کر پاک چین دوستی زندہ باد کے نعرے لگاتی ہے۔

ہم کیا لوگ ہیں ہم 1972ء میں ملک کو کاروبار اور صنعت کا قبرستان بنانے والوں کی برسیاں مناتے ہیں لیکن ہمیں سی ایم لطیف جیسے لوگوں کی قبروں کا نشان معلوم ہے اور نہ ہی یہ معلوم ہے یہ زندگی کی آخری سانس تک پاکستان کو کس نظر سے دیکھتے رہے۔

یہ المیہ اگر صرف یہاں تک رہتا تو شاید ہم سنبھل جاتے شاید ہمارا ڈھلوان پر سفر رک جاتا لیکن ہم نے اب ڈھلوان پر گریس بھی لگانا شروع کر دی ہے ہم بیس کروڑ لوگوں کی قوم ہیں لیکن ارب پتی صرف دو ہیں۔ کیا کام کرنا کیا ترقی کرنا جرم ہے؟ کیا ہم بھی سیاستدانوں بیوروکریٹس اور جرنیلوں کی طرح دوبئی لندن اور نیویارک میں بیٹھ جائیں کیا ہم بھی ایان علی بن جائیں کیا ہم بھی اپنا پیسہ لیں اور ملک سے روانہ ہو جائیں؟ ہم اس ملک میں کام کرنے والے لوگوں کو سی ایم لطیف کی طرح دوسرے ملکوں میں کیوں دیکھنا چاہتے ہیں؟

مجھے اکثر اوقات محسوس ہوتا ہے ہم اس ملک میں کام کرنے والوں اور ترقی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے وہ لوگ جو ریاست کے داماد بن کر پوری زندگی گزار دیتے ہیں وہ ہمارے ہیرو ہوتے ہیں اور جو لوگ ملک بھر کے پیاسوں کے لیے کنوئیں کھودتے ہیں ہم جب تک سی ایم لطیف کی طرح انہیں کنوئیں میں نہ پھینک دیں ہمیں اس وقت تک تسلی نہیں ہوتی ہم محسنوں کو ذلیل کرنے والے لوگ ہیں ہم نے اس ملک میں ملک بنانے والوں کو بخشا ملک بچانے والوں کو بخشا اور نہ ہی ملک سنوارنے والوں کو بخشا ہم نے صرف ملک توڑنے والوں کو سلام کیا۔ (منقول)

❁❁❁

دنیا کی سب سے طاقتور دوربین خلاء میں جانے کے لیے تیار

امریکا، کینیڈا اور یورپ کی مشترکہ اور دنیا کی طاقتور ترین دوربین ''جیمس ویب اسپیس ٹیلی اسکوپ'' (جے ڈبلیو ایس ٹی) کو ایندھن بھرنے کے بعد خلاء میں روانگی کے لیے مکمل طور پر تیار کر دیا گیا ہے۔

یورپی خلائی ایجنسی (ای ایس اے) کی تازہ پریس ریلیز کے مطابق، اسے 22 دسمبر 2021 کے روز ''آریان 5'' راکٹ کے ذریعے خلاء میں روانہ کیا جائے گا۔

بتاتے چلیں کہ ناسا کے تحت اس خلائی دوربین کی تمام آزمائشیں امریکا میں مکمل کی گئیں، جس کے بعد اسے پاناما کینال کے راستے ''یورپین اسپیس پورٹ'' پہنچا دیا گیا جو جنوبی امریکا میں فرانس کے زیرِ انتظام گیانا میں واقع ہے۔ آخری جانچ پڑتال کے بعد اسے یہیں سے خلاء میں روانہ کیا جائے گا۔

یہ بیضوی مدار میں سورج کے گرد چکر لگائے گی جبکہ زمین سے اس کا اوسط فاصلہ تقریباً 15 لاکھ کلومیٹر رہے گا۔

خلاء کے انتہائی تاریک ماحول میں زیریں سرخ (انفراریڈ) شعاعوں کے ذریعے یہ کائنات کے ان دور دراز مقامات کو بھی دیکھ سکے گی جو اس سے پہلے کسی دوربین نے نہیں دیکھے۔

یہ مقامات ہم سے تقریباً 13 ارب 70 کروڑ سال دور ہیں، یعنی ان سے آنے والی روشنی بھی اتنی ہی قدیم ہے۔

سائنسدانوں کا خیال ہے کہ کائنات کے اوّلین ستارے بھی آج سے 13 ارب 70 کروڑ پہلے وجود میں آئے ہوں گے لیکن اب تک کسی بھی دوربین سے انہیں دیکھا نہیں جا سکا ہے۔ جیمس ویب خلائی دوربین ایسے ستاروں کو بھی دیکھ سکے گی۔

ان کے علاوہ یہ دوسرے ستاروں کے گرد زمین جیسے سیارے تلاش کرنے کا اضافی کام بھی کرے گی۔

اس دوربین کا مرکزی آئینہ 18 آئینوں کو آپس میں جوڑ کر بنایا گیا ہے جس کی مجموعی چوڑائی تقریباً 6.5 میٹر ہے۔

طاقتور ہونے کے علاوہ، یہ دنیا کی مہنگی ترین دوربین بھی ہے جس پر تقریباً 9 ارب ڈالر لاگت آئی ہے۔

(بشکریہ ایکسپریس نیوز)

❁❁❁

یادیں ثاقب زیروی

اخبار روزنامہ "انقلاب" میں پہلا دن اور صحافت کا آغاز

مکرم عبدالرحمٰن انور صاحب حضرت سالک کے نام خط لے کر "لاہور" پہنچا۔ دہلی دروازہ، بیت الذکر میں گیا۔ سامان محمد حیات صاحب (کیئر ٹیکر) کے حوالے کیا۔ اور دفتر "انقلاب" کی تلاش میں نِکل کھڑا ہوا۔ لاہور اس سے پہلے بھی کئی دفعہ آیا تھا مگر میرا وہ لاہور مال روڈ، انار کلی، دہلی مسلم ہوٹل اور سٹینڈرڈ ہوٹل تک ہی محدود تھا۔ دفتر "انقلاب" کے بارے میں معلوم ہوا کہ ریلوے روڈ پر "خالصہ سٹریٹ" میں ہے۔ مئی کا مہینہ تھا۔ ساڑھے بارہ کا وقت ہو گا کہ میں منزل مقصود پہنچ گیا۔ باہر ایک چپڑاسی کھڑا تھا اُسے ایک چٹ پر اپنا نام لکھ کر دیا کہ اندر لے جائے۔ وہ چِٹ اُٹھا کر اندر چلا گیا اگلے ہی ثانیے آواز آئی۔ "آجایئے یہ درویشوں کا ڈیرہ ہے یہاں چِٹوں سے ملاقات نہیں ہوتی۔"

میں نے اندر داخل ہوتے ہی کہا... "ثاقب زیروی" سالک صاحب اُٹھ کر ملے اور فرمایا... "یار تم تو اچھے بھلے آدمی ہو میَں نے تو تمہارے خطوط سے ایک عجیب وغریب "مولوی" سا بنا رکھا تھا۔" گویا اسی لمحے بے تکلفی کا آغاز ہو گیا۔

حضرت صاحب کی خیریت دریافت کی جس کے بعد فرمایا: "میرا خیال ہے کہ آج ہی کام شروع کر دیا جائے۔ آپ کی پہلی ڈیوٹی تو یہ ہو گی کہ جب مَیں آجاؤں میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ جایا کریں گے اور خاموشی سے ملاقاتیوں کے ساتھ ہماری باتیں سنا کریں گے یہ باتیں خواہ آپ کے خلاف ہو رہی ہوں آپ کی جماعت کے خلاف یا آپ کے امام کے خلاف آپ کسی بات میں دخل نہیں دیں گے صرف سنتے رہیں گے۔"

اسی اثناء میں مَیں نے صحن میں ایک شخص کو آتے دیکھا جس کی داڑھی سرسید جیسی تھی، موٹی موٹی آنکھیں، سر پر رومی ٹوپی، کرتہ اور اٹنگی شلوار۔ اس نے سالک صاحب کے کیبن میں داخل ہوتے ہی بڑی کھن گرج سے سلام علیک کی۔ اس کے بعد مجھے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: "ثاقب صاحب! یہ ہیں علامہ حسین میر کاشمیری ہمارے ایڈیشن انچارج۔ انہوں نے میری ایک نظم کی پیروڈی بھی کی ہے اور علامہ صاحب یہ ہیں ثاقب زیروی جنہیں صاحبزادہ میرزا بشیر الدین محمود احمد نے قادیان سے انقلاب میں صحافت کی عملی تربیت کے لئے بھیجا ہے اور میرا خیال ہے کہ آج ہی ان کی ٹرانسلیشن کی ڈیوٹی شروع ہو جائے۔ ثاقب صاحب رات کو نیوز ایڈیٹروں کی ڈیوٹی آٹھ بجے شروع ہوتی ہے ان کے ساتھ دو نائب ہیں یوسف العزیز اور ملک مراتب علی تائب جن سے علامہ صاحب کی روزانہ جنگ ہوتی ہے اس لئے کہ وہ آٹھ دس منٹ تاخیر سے پہنچتے ہیں اور علامہ صاحب کے آٹھ بجے سے مراد سات بج کر اُنسٹھ منٹ ہیں۔ آٹھ بج کر ایک منٹ نہیں"...اور مجلس برخواست ہو گئی۔ مجھے تو اور کوئی کام نہیں تھا مَیں پونے آٹھ بجے ہی مدیران مخابرات کے کمرے میں پہنچ گیا۔ پانچ منٹ بعد علامہ صاحب بھی آ گئے۔ گو اُن کے دونوں نائب اس دن بھی پانچ منٹ کی تاخیر سے پہنچے لیکن شاید میری موجودگی کی وجہ سے علامہ صاحب اُن سے اُلجھے نہیں اور مجھے حکم دیا کہ مَیں ہر ترجمہ شدہ خبر غور سے پڑھتا رہوں۔ ڈیٹ لائن کیسے دی جاتی ہے۔ شہر کا نام اور سرخی وغیرہ وغیرہ۔ کوئی آدھ گھنٹے کے بعد علامہ صاحب نے ٹیلی پرنٹر سے ایک چھوٹی سی خبر اُتار کر مجھے دی کہ اس کا ترجمہ کر ڈالئے اس ہدایت کے ساتھ کہ "اگر اس میں کوئی مشکل لفظ ہو تو اس کی ڈکشنری نمبر ایک سے دیکھئے۔ اگر اس میں نہ ہو تو اس دُوسری ڈکشنری نمبر دو میں دیکھئے اور اگر اس میں بھی نہ ہو تو پھر (اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اس ڈکشنری نمبر تین سے پوچھئے۔"

خدا جس کی لاج رکھے وہ خبر ٹھیک ترجمہ ہو گئی۔ حکم ملا سرخی لگایئے وہ بھی اتفاقاً ٹھیک لگ گئی تو علامہ صاحب نے رات کے کاتبوں کے ہیڈ کو آواز دی۔ "لال دین کوٹھ خالی ہے؟" واضح رہے کہ علامہ "انقلاب" نام کے دونوں طرف کی خالی جگہوں کو کوٹھ کہا کرتے تھے۔ جواب ملا "خالی ہے"... "تو وہاں قادیان سے آئے ہوئے ثاقب زیروی صاحب کی خبر لگا دیجئے اور ثاقب زیروی صاحب کی خبر لگا دیجئے اور ثاقب صاحب جایئے میرزا محمود کو تار دے دیجئے کہ میری سب سے پہلے ترجمہ کی ہوئی خبر کوٹھے پر لگ گئی ہے۔"

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ (کوثر: 3) وقف کے بعد مجھے انقلاب (روزنامہ) لاہور میں صحافت کی عملی تربیت کے لئے لاہور میں آئے ہوئے پانچ چھ روز ہو گئے تھے۔ مَیں رات کو دہلی دروازے کی مسجد کے محراب میں سوتا تھا میرا سامان مولوی محمد حیات صاحب (کیئر ٹیکر) کی نگرانی میں رہتا تھا۔ مَیں ناشتے کے بعد صرد ایک وقت کھانا کھایا کرتا تھا۔ تاکہ رات کی ڈیوٹی میں نیند نہ آئے اور میرے الاؤنس میں سے کچھ بچ بھی رہے تاکہ گھر بھیج سکوں۔ ایک دن لنڈے بازار میں سے گزر رہا تھا کہ میرے پاس آکر سائیکل سے ایک باوردی (سب انسپکٹر پولیس) اترا اور اس نے مجھ سے دریافت کیا۔

تھانیدار: "ثاقب صاحب آپ یہاں کہاں؟"

ثاقب: "مَیں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا ہے۔ اور زندگی "وقف" کر دی ہے اور حضور نے مجھے روزنامہ انقلاب میں صحافت کی عملی تربیت کے لئے بھجوایا ہے۔"

تھانیدار: "آپ رہتے کہاں ہیں؟" ثاقب: "دہلی دروازے کی بیت الذکر میں۔"

تھانیدار: "کھانا کہاں سے کھاتے ہیں؟" ثاقب: "بازار سے۔"

تھانیدار: "میرا نام حفیظ احمد ہے۔ میں بحمد للہ احمدی ہوں مَیں یہاں نولکھا پولیس اسٹیشن کا انچارج ہوں۔ تھانے کی ڈیوڑھی کے اوپر میرا کمرہ ہے۔ مَیں اکثر نیچے بیٹھتا ہوں۔ آپ وہاں آجایئے۔ آپ کو انشاءاللہ وہاں پر آرام ملے گا! چلئے آپ کا سامان (بیت الذکر) سے لاتے ہیں۔ ایک تانگہ روکا گیا۔"

(بیت الذکر) سے اُس پر میرا بستر اور سوٹ کیس رکھا گیا اور ہم لوٹ کر نولکھا پولیس سٹیشن آگئے۔ کمرہ کشادہ تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ وہاں لکھنے لکھانے کا سامان (قلم۔ دوات اور کاغذ تک) موجود تھے۔ لیکن میرا دل پانچویں چھٹے دن وہاں سے اُکتا گیا اور مَیں نے ایک دن چوہدری عبدالمالک مرحوم (تحصیلدار) کے فرزند دلبند چوہدری حفیظ احمد (بہلولپوری) سے کہا: "مَیں رات کو ویسے نہیں سوسکتا۔ میری ڈیوٹی ہوتی ہے۔ صبح دس بجے کے بعد آپ کے اے ایس آئی (جو تین تھے ایک مسلمان ایک ہندو اور ایک سکھ)

ملزموں کی کچھ اس طرح چھترول کرتے ہیں کہ ان کی چیخم ودھاڑ سے میری نیند ہَوا ہو جاتی ہے اور مَیں کچھ لکھ بھی نہیں سکتا مجھے واپس بیت الذکر ہی میں پہنچا دیجئے۔‘‘

کہنے لگے۔ مَیں نے اس لئے آپ کو یہاں رکھا تھا کہ آپ میرے پاس رہیں گے۔ ویسے میرے پاس تین منزلہ مکان بھی ہے۔ دل محمد روڈ پر ’’کے بی چشتی‘‘ کے کارخانے کے سامنے مَیں نے تو ’’صحبت ناجنس‘‘ سے محفوظ رکھنے کے لئے آپ کو یہاں رکھا تھا ورنہ میرے بچے وہاں نہیں ہیں وہ گاؤں میں ہیں میرے اور چوہدری محمد امین باجوہ (سب انسپکٹر پولیس) کے بس دوار دلی وہاں رہتے ہیں۔ آپ وہاں چل رہیے۔‘‘ اور انہوں نے فوراً تانگہ منگوایا اور مجھے وہاں پہنچا دیا۔ اور مَیں کوئی دو سال وہاں رہا۔ میرے تمام اخراجات برداشت کرتے رہے۔ پھر تقسیم ہوگئی میری بچی کھچی فیملی لُٹ کھٹ کر پاکستان آگئی۔ اُن دنوں ٹرانسپورٹ کی سخت قلت تھی۔ تقسیم کے بعد انہیں ایس ایس پی صاحب کا ریڈر لگا دیا گیا تھا۔ وہ بطور خاص اجازت لے کر میری فیملی کو قصور سے لاہور لائے اور بہ اہتمام خاص انہیں سیالکوٹ پہنچایا۔ جہاں میاں مظفر احمد صاحب (ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ) نے چوہدری اسلام الدین صاحب مجسٹریٹ۔ برگیڈیئر مظفر الدین (جو بعد میں میجر جنرل ہوئے اور مشرقی پاکستان کے گورنر بھی رہے) اور میری فیملی کو ایک بہت بڑی کوٹھی الاٹ کر دی تھی جس کے بالائی حصہ میں میری فیملی کے لوگ رہتے تھے۔ چوہدری حفیظ احمد بعد میں ڈی ایس پی ہو گئے اور ایک ملزم کا تعاقب کرتے ہوئے (شدید انجائنا کے باعث) اللہ کو پیارے ہو گئے۔ میرا خدا اُن کی بال بال مغفرت فرمائے اور انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ انہوں نے میرے زیر تربیت عرصے میں میرے تمام اخراجات برداشت کئے۔ میرے تمام تردّدات دُور فرما دیئے۔

(تجربات جو ہیں امانت حیات کی صفحہ 36 تا 41)

سرکارِ مدینہ ﷺ

(ثاقب زیروی)

جو سرورِ ﷺ کونین سے منسوب نہ ہوگا
وہ خالقِ کونین کو محبوب نہ ہوگا

بیداریٔ احساس کی دولت نہ ملے گی
اس راہ میں جب تک کوئی مجذوب نہ ہوگا

افکار میں رَچ جائیں جو انوارِ محمد ﷺ
جو کام بھی ہوگا۔ کبھی ناخوب نہ ہوگا

ایمان کی تقفیق عطا ہو تو کرم ہے
کچھ اَور مِری رُوح کو مطلوب نہ ہوگا

مَیں اُنکا ہوں اُن کیلئے بیتاب ہوں ہردم
ہر درد مِرے نام سے منسوب نہ ہوگا

انسان کے زخموں کا لہو جسمیں نہیں ہے
وہ اشک مِری آنکھ کو مرغوب نہ ہوگا

سرکارِ ﷺ مدینہ سے جسے عشق ہے ثاقب
وہ دل غمِ حالات سے مرعُوب نہ ہوگا

❁❁❁

ارے نالائق تم مسجد میں نیکر پہن کر کیوں آ گئے؟

اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ ایک دن میں نیکر پہن کر سپارہ پڑھنے مسجد چلا گیا۔ مولوی صاحب غصے میں آ گئے، بولے: ارے نالائق تم مسجد میں نیکر پہن کر کیوں آ گئے؟ بے وقوف ایسے مسجد میں آؤ گے تو جہنم میں جاؤ گے!!

میں نے گھر آ کر ماں جی کو بتایا تو ماں بولی:

’’پتر مولوی صاحب غصے میں ہوں گے جو انھوں نے ایسا کہہ دیا ورنہ بیٹا جہنم میں جانے کے لیے تو بڑی سخت محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔‘‘

جہنم حاصل کرنے کے لیے پتھر دل ہونا پڑتا ہے۔ جہنم لینے کے لیے دوسروں کا حق مارنا پڑتا ہے، قاتل اور ڈاکو بننا پڑتا ہے، فساد پھیلانا پڑتا ہے، مخلوقِ خدا کو اذیت دینی پڑتی ہے، نہتے انسانوں پر آگ اور بارود کی بارش کرنا پڑتی ہے، محبت سے نفرت کرنا پڑتی ہے، اس کے لیے ماؤں کی گودیں اجاڑنی پڑتی ہیں، رب العالمین اور رحمت للعالمین سے تعلقات توڑنے پڑتے ہیں، تب کہیں جا کر جہنم ملتی ہے۔

تُوں تو اتنا کاہل ہے کہ پانی بھی خود نہیں پیتا۔ تجھ سے یہ محنت کیونکر ہو سکے گی؟ تُوں تو چڑیا کی موت پر ہفتوں روتا رہتا ہے پھر تُو اتنا پتھر دل کیسے بن سکتا ہے؟

❁❁❁

14 منزلہ کروز شپ کو عوامی تفریح کا ذریعہ بنانے کی امیدیں دم توڑ گئیں

کراچی: پاکستان کی بندرگاہوں کی تاریخ میں لنگر انداز ہونے والے سب سے بڑا کروز شپ کو ٹکڑے ٹکڑے ہی کیا جائے گا، پرتعیش سفری سہولتوں سے آراستہ عظیم الشان مسافر بردار بحری جہاز کو عوامی تفریح کا ذریعہ بنانے کی تمام امیدیں دم توڑ گئیں۔

ایکسپریس نیوز کے مطابق پاکستان میں شپ بریکنگ کے لیے لائے جانے والے کروز شپ کے سیاحتی مقاصد کے لیے استعمال کے امکانات ختم ہوگئے۔ وزیراعظم کے مشیر برائے بحری امور محمود مولوی نے اس حوالے سے کی جانے والی قیاس آرائیوں کو مسترد کرتے ہوئے کہا کہ معاہدے کے مطابق کروز شپ گڈانی شپ بریکنگ یارڈ میں اسکریپ میں بدلنے کے لیے لایا گیا ہے اور اسے فیری سروس کے لیے استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

وزیراعظم کے معاون خصوصی برائے بحری امور محمود مولوی کے مطابق 1200 کمروں پر مشتمل اطالوی پسینجر جہاز اسکریپ کے لیے 2 ارب روپے میں خریدا گیا ہے جسے فیری سروس کے لئے استعمال نہیں کیا جاسکتا، معاہدے کے مطابق کروز شپ کو گڈانی شپ بریکنگ یارڈ میں صرف اسکریپ کے لیے لایا گیا ہے، اس کے کانٹریکٹ میں واضح الفاظ میں لکھا گیا ہے کہ یہ صرف اسکریپ کے لیے استعمال ہوگا۔

انہوں نے میری ٹائم اور پورٹ حکام کی جانب سے جہاز کو داخلے کی اجازت نہ دینے کی اطلاعات کو بے بنیاد قرار دیا۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان میں کروز شپ چلانے کے لیے پالیسی موجود ہے جو بھی سرمایہ کار یا شپنگ کمپنی چاہے اس پالیسی کے تحت کراچی تا گوادر اور دبئی تک فیری سروس چلا سکتا ہے، حکومت نے اس پر دس سال کی ٹیکس چھوٹ بھی دی ہے، اس سلسلے میں پی این ایس سی کو باقاعدہ باہمی اشتراک کے ساتھ کام کرنے کی بھی اجازت دی گئی ہے۔

واضح رہے کہ گڈانی شپ بریکنگ یارڈ کے 42 نمبر گودی پر لنگر انداز ہونے والا شاندار کروز شپ 14 منزلوں پر مشتمل ہے جس میں آسائشوں اور سہولیات سے آراستہ 1411 کمرے ہیں۔ اس جہاز کو 1993 میں اٹلی کی ایک کمپنی نے بنایا تھا، نومبر 2011 میں اس جہاز کی تزئین و آرائش پر 90 ملین یورو خرچ کیے گئے تھے۔

اس کروز شپ میں 7 اسٹار ہوٹل، شاپنگ مالز، کیسینو، گیمنگ زون اور تین بڑے ہال رومز موجود ہیں۔ کروز شپ آرٹ کے نادر نمونوں، منفرد فن پاروں اور آرائشی اشیاء کا بھی ذخیرہ ہے۔ جہاز میں جدید مشینوں پر مشتمل ہیلتھ جمنازیم دیکھنے کے قابل ہے۔ جہاز کے ڈائننگ ہالز سیون اسٹار ہوٹلوں کی طرح آراستہ ہیں جو آنے والے کچھ عرصہ میں ایشیاء کی سب سے بڑی کباڑی مارکیٹ شیر شاہ میں فروخت ہوتے نظر آئیں گے۔

عوامی حلقوں نے اس جہاز میں بھرپور دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ جہاز تک عوام کی رسائی ممکن بنانے کے لیے اسے کراچی کے ساحل پر لنگر انداز کیا جائے تاہم حکام نے اسے قوانین کی خلاف ورزی قرار دیتے ہوئے انکار کیا۔

ماہرین کا یہ بھی کہنا ہے کہ اگر اتنے بڑے جہاز کو کراچی کی بندرگاہ پر کھڑا کیا گیا تو پورٹ پر مال بردار بحری جہازوں کی آمد و رفت متاثر ہوگی اور پورٹ کی سیکیوریٹی کو بھی خدشات لاحق ہوں گے۔

❁❁❁

حضرت مولانا ذوالفقار علی خان صاحب گوہر رامپوری کی یاد میں

ازخامہ ٔ قیس مینائی نجیب آبادی

پُوچھتے کیا ہو مقامِ گوہر
پڑھ کے خود دیکھو کلامِ گوہر
مُنکشف آپ پہ ہوجائے گا
س قدر اونچا ہے بامِ گوہر
سلکِ اشعار منظّم۔ تنظیم
واہ رے نظم و نظام گوہر
لکھ دیا صبحِ ازل میں حق نے
ادبستان بنامِ گوہر
جبکہ اِک شاعر فنکار ہیں آپ
کیوں نہ مشہور ہو نامِ گوہر
وجہِ افزائشِ ایمان و یقیں

زندگی بخش پیامِ گوہر
بند کوزہ میں سمندر یعنی
بادۂ عشق بجامِ گوہر
دست گوہر میں تھا دامانِ مسیح
دستِ قدرت میں زمامِ گوہر
شرفِ قربِ رسول اعظم
قصرجنّت میں قیامِ گوہر
آپ ہیں حضرت مہدی کے غلام
اور ہے قیس غلامِ گوہر
قیس مہدی کے کا غلام
ذرّۂ خاک بہ گامِ غلاموں گوہر

حکومت طلبا اور تعلیم سے لاتعلق ہو چکی ہے؟

تحریر: تنویر قیصر شاہد

کیا پاکستان کی پرائیویٹ اور پبلک یونیورسٹیوں کے جملہ معاملات سے ہماری صوبائی اور مرکزی حکومتیں لاتعلق ہو چکی ہیں؟ کیا نجی اور سرکاری جامعات کو من مانی کرنے اور بے لگام ہو کر طلبا و طالبات سے من پسند اور بھاری فیسیں بٹورنے کی کھلی چھٹی دی جا چکی ہے؟ کوئی پوچھنے والی ایسی اتھارٹی نظر نہیں آ رہی جو سرکاری اور نجی جامعات کی انتظامیہ سے استفسار کر سکے کہ داخلہ ٹیسٹوں میں بیٹھنے کے نام پر بھی طلبا و طالبات سے کمر شکن پیسے وصول کیے جا رہے ہیں۔ مجھے اس قیامت کا شاید معلوم ہی نہ ہو پاتا اگر مجھے گھر آئے کچھ بچوں کے مسائل سُننے کا براہِ راست موقع نہ ملتا۔ ابھی پچھلے ہفتے ملک بھر کے ینگ ڈاکٹروں پر پولیس نے جو مظالم ڈھائے ہیں، اس کی بازگشت ابھی تھمی نہیں ہے۔ اسلام آباد میں PMC کی عمارت کے سامنے احتجاجی طلبا اور پولیس کے درمیان جو افسوسناک تصادم ہُوا ہے، اس کا احوال سب نے دیکھا اور سُنا ہے۔

میرے بڑے بیٹے کے چار دوست ہمارے غریب خانہ آئے ہُوئے تھے۔ بیٹے سمیت پانچوں دوستوں نے حال ہی میں بی ایس انجینئرنگ کی ہے۔ اب سب، اپنے اپنے پسندیدہ شعبوں میں، ایم ایس کرنے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ بیٹھک میں بیٹھے وہ باتیں کر رہے تھے کہ اجازت لے کر مَیں بھی اُن کے پاس جا بیٹھا۔ سب اکٹھے ہی ایم ایس کی نئی کلاسوں میں داخلے کے خواہشمند تھے لیکن پہلے سب کو اسلام آباد کی تین یونیورسٹیوں میں علیحدہ علیحدہ داخلہ ٹیسٹوں کے written مراحل سے گزرنا تھا۔ اور اس مرحلے سے بھی پہلے انھیں نجی اور سرکاری جامعات میں ٹیسٹ کے لیے داخلہ فیس بھرنی تھی۔ مَیں نے سب سے ٹیسٹ فیس بارے استفسار کیا تو خاصی حیرت بھی ہُوئی اور پریشانی بھی۔ ایک یونیورسٹی داخلہ ٹیسٹ کے لیے پانچ ہزار روپے، دوسری تین ہزار روپے اور چوتھی ڈھائی ہزار روپے کا مطالبہ کر رہی تھی۔ مجھے حیرانی اس بات کی تھی کہ صرف داخلہ ٹیسٹ کے لیے ہزاروں روپے کی فیس چہ معنی دارد؟ ٹیسٹ کا سوالنامہ صرف ایک چھوٹے سے کاغذ پر مشتمل ہوتا ہے۔ اور بس۔ ٹیسٹ میں بیٹھنے والے بچے اپنے خرچ پر یونیورسٹی پہنچتے ہیں۔ کمرۂ امتحان میں صاف پانی تک فراہم نہیں کیا جاتا۔ پھر یہ ہزاروں روپوں میں ٹیسٹ فیس کس مد میں؟۔

میرا تجسس بڑھا تو دوسرے روز میں خود ایک جامعہ کے متعلقہ ڈیپارٹمنٹ پہنچ گیا۔ میرا بیٹا مجھے منع ہی کرتا رہا لیکن مَیں پہنچ گیا۔ متعلقہ شعبے کے ذمے دار کلرک بادشاہ سے ہزاروں روپے میں وصول کی جانے والی اس داخلہ ٹیسٹ فیس کی جزئیات بارے کچھ سوالات پوچھے۔ کوئی مناسب اور شافی جواب دینے کے بجائے وہ حضرت تو میرے بال نوچنے کو آ گئے۔ میرا بیٹا تمیز کے ساتھ خاموش دیکھتا رہا۔ وہ بولا تو بس یہ بولا: ''بابا، اسی لیے مَیں نے آپ سے کہا تھا کہ ان لوگوں سے وجہ جاننے کا کوئی فائدہ نہیں ہے، چلیے گھر چلتے ہیں۔'' گھر تو مَیں آ گیا لیکن تب سے مسلسل خود اذیتی کے عذاب میں مبتلا ہُوں۔

زیادہ اذیتناک بات یہ ہے کہ جو کم وسائل والدین اپنی ساری اولاد کو اعلیٰ تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کہاں جائیں؟ کہاں فریاد کریں؟ وہ یہ بھاری داخلہ ٹیسٹ فیسیں کہاں سے پوری کریں؟ اور اگر داخلہ ہو بھی جاتا ہے تو ہر سمسٹر پر لاکھوں روپے کی فیس کہاں سے لائیں؟ یاد رہے کہ ''وطنِ عزیز'' کی ہر پرائیویٹ اور پبلک یونیورسٹی میں ہر سمسٹر کی فیس لاکھ، سوا لاکھ روپے سے کم نہیں ہے۔ فیس کے علاوہ بچے اور بچی کے کپڑوں، ٹرانسپورٹ، ہوسٹل، جیب خرچ پر ہزاروں روپے کے اخراجات اضافی طور پر اُٹھتے ہیں۔ گویا جامعہ نجی ہو یا سرکاری، فی سمسٹر ایک بچے پر کم از کم دو لاکھ روپے خرچہ آتا ہے۔ ایک سال میں چار لاکھ روپے سے زائد۔ اور اگر کسی والدین کے تین بچے بیک وقت یونیورسٹی گوئنگ ہوں اور والد کی تنخواہ ہی پچاس ساٹھ ہزار روپے ہو، وہ اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم کیسے دلوا سکے گا؟ یوں لگتا ہے جیسے پاکستان کی یونیورسٹیوں سے یہ تبدیلی حکومت لاتعلق ہو چکی ہے۔ یہ بیگانگی یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ جامعات کی انتظامیہ بے مہار اور بے مہر ہو چکی ہیں۔ ان پر کوئی چیک رہا ہے نہ نگرانی کا کوئی معیار۔ حکومت کی طلبا و طالبات کے مسائل اور مصائب سے لاتعلقی اس ''بلندی'' پر پہنچ چکی ہے کہ HEC نے ذہین ترین طلبا و طالبات کے وظائف روک دیے ہیں۔ ایچ ای سی سے پوچھا جائے تو وہ کھرا سا جواب دیتی ہے: ہم کیا کریں؟ تبدیلی سرکار نے ہمارے فنڈز روک رکھے ہیں یا فنڈز میں کٹوتی کر دی ہے۔ ایچ ای سی کے بین سُنے جائیں تو وحشت میں اپنا گریبان چاک کرنے کو جی چاہتا ہے۔ نوبت ایں جا رسید کہ غیر ممالک میں سرکاری وظائف پر اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے گئے ہمارے طلبا کے تبدیلی سرکار نے مبینہ طور پر وظائف بھی بند کر دیے ہیں۔ وہ بیچارے وہاں بیٹھ کر سینہ کوبی کر رہے ہیں۔ حکومت کے کانوں پر مگر جُوں تک نہیں رینگ رہی۔ یوں احساس ہو رہا ہے جیسے اس حکومت اور اس کے ذمے دار کارپردازوں کو تعلیم نام کی ہر شئے سے بیزاری ہے۔ تعلیم حاصل کرنا اور تعلیمی اداروں میں داخلہ لینا کبھی ایسا دشوار اور پیچیدہ نہیں تھا جتنا اب کر دیا گیا ہے۔ مرکزی حکومت نے اٹھارویں ترمیم کے تحت تعلیم کو ویسے بھی اپنے ہاں سے ''دیس نکالا'' دے رکھا ہے۔

پھر تعلیم زدگان اپنے دکھ رکھیں تو کس کے سامنے رکھیں؟ وزیر اعظم صاحب انگریزی زبان کے خلاف بیان بازی کر کے اپنی پاپولسٹ سیاست کا شوق پورا کر رہے ہیں اور پنجاب میں اُن کے وزیر تعلیم کی زبان پر اُردو کم اور انگریزی زیادہ رواں نظر آتی ہے۔ ویسے سارے ملک میں ایک ہی نصابِ تعلیم کو متعارف کروانے کا حکومتی بیانیہ بھی خوب ہی لطیفہ ہے۔ لطائف ہر جگہ نظر آ رہے ہیں۔ ہمارے میڈیا پر اُن تعلیمی مسائل پر بات کرنا ویسے بھی عنقا ہو چکا ہے جن سنگین اور بنیادی سوالات کی اساس پر والدین کی دردِسری روز بروز بڑھ رہی ہے۔ سیاست کاری کا شوق ہر مسئلے پر غالب ہے۔ تعلیم اور تعلیم یافتگان سے

ریاست مکمل طور پر بیگانہ ہو چکی ہے۔ ویسے ریاست کا اپنے اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں سے حُب الوطنی کا مطالبہ روز بروز بڑھ رہا ہے۔ ریاست اور ریاستی ادارے اگر دانستہ اپنے تعلیم یافتگان کی روزی روٹی کا بنیادی اور ضروری بندوبست ہی نہ کر سکیں تو حُب الوطنی کے گیت کس زبان سے کیسے ادا ہوں گے؟ معروف کہاوت ہے بَھرا پیٹ فارسیاں بولتا ہے۔ خالی پیٹ اور بے روزگاری زدہ اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان حُب الوطنی کی آواز لگائے گا تو کہاں سے؟ ایک ادارے (PIDE) نے سروے شایع کیا ہے کہ پاکستان میں یونیورسٹی سے فارغ التحصیل اعلیٰ تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوانوں کی شرح 21 فیصد ہے۔ کیا یہ شرح ہمارے حکمرانوں کے لیے قابلِ فخر ہو سکتی ہے؟

معروف ادارے ''گیلپ'' نے ایک سال قبل سروے کروایا تھا جس میں یہ نتیجہ نکلا کہ پاکستان میں پوسٹ گریجویٹ ڈگری ہولڈر زخواتین میں سے 60 فیصد بے روزگار ہیں۔ پاکستان بنا تو اُس وقت ملک میں صرف دو جامعات تھیں جن میں صرف 600 طلبا زیرِ تعلیم تھے۔ آج ان نجی اور سرکاری یونیورسٹیوں کی تعداد 200 ہو چکی ہے اور ملک میں بے روزگاری کا سیلاب گردن تک آ پہنچا ہے۔ پرواہ مگر کسے ہے؟

❁❁❁

ذیابیطس کے مریض اومیکرون سے کیسے بچ سکتے ہیں؟

ذیابیطس اور بلڈ پریشر جیسے امراض میں مبتلا افراد کو کورونا وائرس اور اومیکرون کے بڑھتے ہوئے کیسز کے درمیان محتاط رہنے کی ضرورت ہے اور اپنی صحت کو ہر قیمت پر ترجیح دینی چاہیے۔

دنیا بھر میں اومیکرون کے تیزی سے بڑھتے ہوئے کیسز کی وجہ سے ماہرین لوگوں کو مشورہ دے رہے ہیں کہ وہ جلد از جلد مکمل ویکسین لگوائیں اور باقاعدگی سے ورزش کر کے اور اینٹی آکسیڈنٹ سے بھرپور غذا کھا کر اپنی قدرتی قوت مدافعت میں اضافہ کریں۔

بین الاقوامی میڈیا رپورٹ کے مطابق ماہرین صحت کا کہنا ہے کہ بروقت اور غذائیت سے بھرپور کھانا کھانے سے آپ کی قدرتی قوت مدافعت میں اضافہ یقینی ہوگا۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ ذیابیطس کے شکار لوگوں میں قوت مدافعت کی سطح کم ہوتی ہے، انہیں اپنی شوگر کی سطح کو کنٹرول میں رکھنے، اپنے ڈاکٹروں سے ملنے، ضرورت کے مطابق انسولین لینے، خود کو ویکسین لگوانے کی ضرورت ہوتی ہے، اس کے علاوہ انہیں اپنے وزن کا خیال رکھنا چاہیے اور باقاعدگی سے ورزش کرنی چاہیے۔

موٹاپا کورونا وائرس اور اومیکرون کی صورت میں شدید بیماری کے امکانات کو بڑھا سکتا ہے، موٹاپا اور ذیابیطس کا مجموعہ خاص طور پر مہلک ہے لہٰذا ماہرین ذیابیطس کے شکار لوگوں کو اپنا وزن بھی کنٹرول میں رکھنے کا مشورہ دیتے ہیں۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ موٹاپے کا ہونا آپ کی صحت کے لیے نقصان دہ ہے جس کی وجہ سے آپ کئی بیماریوں کا شکار ہو سکتے ہیں، اگر آپ کا وزن زیادہ ہے تو آپ کو کورونا وائرس اور اومیکرون کے ہونے کے امکانات زیادہ ہو سکتے ہیں۔

آپ کی خوراک آپ کو انفیکشن اور بیماریوں سے بچانے میں بھی بڑا کردار ادا کر سکتی ہے، وائرس سے بچنے کے لیے اینٹی آکسیڈینٹ سے بھرپور غذا تجویز کی جاتی ہے۔

ماہرین نے کہا کہ اپنی خوراک میں گری دار میوے، پھل اور سلاد جیسے اینٹی آکسیڈنٹس کو شامل کریں۔ اینٹی آکسیڈنٹس بنیادی طور پر آپ کے ڈی این اے کو نئے قسم کے نقصانات سے روکتے ہیں۔

ماہرین نے مزید کہا کہ براہ کرم اپنی صحت کا خیال رکھیں اور اپنے ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق خوراک لیں تاکہ اومیکرون سے بچ سکیں۔

❁❁❁

کیا فزکس خدا کے وجود کو ثابت کر سکتی ہے؟

تحریر: مونیکا گریڈی

میں خدا پر ایمان رکھتا تھا (میں اب دہریہ ہو چکا ہوں) لیکن میں نے ایک سیمینار میں مندرجہ ذیل سوال سنا، جو کہ سب سے پہلے آئنسٹائین نے اٹھایا تھا، اور یہ سوال سن کر میں ایک دم سے ساکت ہو گیا۔ وہ یہ کہ: 'اگر کسی خدا کا وجود ہے جس نے یہ ساری کائنات اور اس کے تمام قوانین کو تخلیق کیا، تو کیا یہ خدا خود اپنے بنائے ہوئے قوانین کے تابع ہے یا خدا اپنے ہی بنائے ہوئے قوانین سے ماورا ہو سکتا ہے، مثلاً روشنی کی رفتار سے تیز سفر کرنا اور اس طرح کئی جگہوں پر ایک ہی وقت میں موجود ہونا۔' کیا اس سوال کا جواب خدا کے وجود یا عدمِ وجود کو ثابت کر سکتا ہے یا یہ ایک ایسا مقام ہے جہاں سائنسی ایمپیریسزم (فلسفہ کا یہ نظریہ کہ علم تجربے اور عملی ثبوت سے حاصل ہوتا ہے) اور مذہب کا باہمی مکالمہ ہوتا ہے اور وہاں کسی بات کا کوئی جواب نہیں موجود ہوتا ہے؟

(ڈیوڈ فراسٹ، عمر 67 برس، لاس اینجلیز، امریکہ)۔

2px presentational grey line

میں اُن دِنوں لاک ڈاؤن میں بند تھی جب مجھے یہ سوال موصول ہوا اور میں نے فوراً اس کا جواب تلاش کرنا شروع کر دیا۔ یہ وقت واقعی کافی پریشان کن وقت تھا۔ تکلیف دہ واقعات ہو رہے تھے، جیسا کہ عالمی وبا وغیرہ، ایسے حالات ہمارے دلوں میں خدا کے وجود کے بارے میں سنجیدہ سوالات پیدا کرتے ہیں: اگر کسی رب العالمین کا وجود ہے، تو پھر اتنی تباہی اور بربادی کیوں ہو رہی ہے؟ یہ خیال کہ شاید خدا بھی طبیعیاتی قوانین کے تابع ہے۔ جو علومِ کیمیا اور علومِ حیاتیات کے بھی حاکم ہیں۔ یہ ایک ایسا خیال تھا جس پر مزید تحقیق کی ضرورت تھی۔ اگر خدا خود طبیعیاتی قوانین کو توڑنے کے قابل نہیں ہے تو پھر ظاہر ہے وہ اتنا طاقتور نہیں ہو گا جتنا عظیم ہم اُسے سمجھتے ہیں۔ لیکن اگر وہ طاقتور ہو سکتا ہے تو پھر ہم نے کائنات میں طبیعیات کے قوانین کے ٹوٹنے کے شواہد کیوں نہیں دیکھے ہیں۔

اس سوال کو سمجھنے کے لیے اس کو جزویات میں تقسیم کرتے ہیں۔ پہلا نکتہ: کیا خدا روشنی کی رفتار سے سفر کر سکتا ہے؟ آیئے اس سوال کا اس کی ظاہری صورت کے ساتھ جائزہ لیتے ہیں۔ روشنی ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے سفر کرتی ہے۔ ہم زمانہ طالب علمی میں پڑھتے رہے ہیں کہ روشنی کی رفتار سے زیادہ کوئی شے سفر نہیں کر سکتی ہے۔ یہاں تک کہ امریکی سائنس فکشن 'سٹار ٹریک' میں یو ایس ایس انٹرپرائیز اُس وقت بھی روشنی کی رفتار سے زیادہ تیز سفر نہیں کر سکتا جب اس کے ڈیلیتھیم میں تبدیل ہونے والے ذرات اپنی تیز ترین رفتار میں حرکت کر رہے ہوتے ہیں۔

لیکن کیا یہ حقیقت ہے؟ ابھی چند برس پہلے کی بات ہے طبیعیات کے ماہرین کے ایک گروپ نے یہ تحقیقی مفروضہ شائع کیا کہ 'ٹیکیونز' کہلانے والے ذرات نے روشنی کی رفتار سے زیادہ تیز سفر کیا۔ خوش قسمتی سے ایسے ذرات کے حقیقت میں موجود ہونے کے بہت کم امکانات ہیں۔ اگر ان کا وجود ہوتا تو یہ ایک تخیلاتی کمیت ہوتی اور اس سے خلا اور وقت کے سٹرکچر (ڈھانچے) کی شکل بگڑ جاتی۔ جس کے نتیجے میں علت و معلول کے قانون میں بگاڑ پیدا ہو جاتا۔ اس لیے اب تک ایسا لگتا ہے کہ کوئی بھی شے روشنی کی رفتار سے زیادہ تیز سفر نہیں کر سکتی ہے۔ یہ مشاہدہ اپنی جگہ خدا کے وجود کے بارے میں کوئی بات نہیں بتاتا ہے۔ اس سے صرف روشنی کے تیز رفتار کے ساتھ سفر کے بارے میں معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ اگر خدا کا وجود ہوتا تو ایک سوال یہ پیدا ہوتا کہ کیا وہ طبیعیات کے سائنسی قوانین کا پابند ہوتا۔ ایسے موضوعات پر بحث اس وقت مزید دلچسپ ہو جاتی ہے جب ہم اس بات پر غور کرتے ہیں کہ جب سے روشنی نے سفر کرنا شروع کیا اس وقت سے اب تک اس نے کتنا فاصلہ طے کر لیا ہو گا۔ فرض کرتے ہیں کہ 'بگ بینگ' کہلانے والے تخلیق کے پہلے بڑے دھماکے سے بننے والی کائنات کے آغاز سے لے کر اب تک روشنی کا سفر 300,000 کلومیٹر فی سیکنڈ سے جاری ہے۔

کائنات کے متعلق اندازہ ہے کہ اگر اس کی کوئی سرحد ہے تو یہ شاید 46 ارب نوری سالوں کے فاصلے پر ہو۔ جس طرح وقت گزر رہا ہے کائنات کا حجم بھی بڑھ رہا ہے اور روشنی کو ہم تک پہنچنے کے لیے اور زیادہ سفر کرنا پڑے گا۔

جتنی بڑی کائنات ہمیں نظر آتی ہے وہ اس سے کہیں زیادہ بڑی ہے، لیکن اب تک ہم نے جو زیادہ سے زیادہ فاصلے کی کوئی شے دیکھی ہے تو وہ GN-z11 کہلانے والی کہکشاں ہے جسے 'ہبل سپیس ٹیلی سکوپ' سے دیکھا گیا اور اس کی روشنی زمین تک تقریباً 13.4 ارب نوری سال گزرنے کے بعد پہنچی۔ لیکن جس وقت اس روشنی کی شعاؤں نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا اُس وقت یہ کہکشاں ہماری کہکشاں سے تین ارب نوری سال کی دوری پر تھی جس میں ہمارا کرّہ ارض موجود ہے اور جسے ہم 'ملکی وے' کہتے ہیں۔

ہم پوری کائنات کو بصری طور پر دیکھ نہیں سکتے ہیں جس کا 'بگ بینگ' سے آغاز ہوا تھا۔ کچھ ماہرین کہتے ہیں کہ ہمیں اس بات کا کوئی علم نہیں ہے کہ آیا کائنات کے دیگر حصوں میں طبیعیات کے قوانین مختلف طرح کام کرتے ہیں۔ شاید وہاں کے اپنے مقامی طبیعیاتی قوانین ہوں جو حادثاتی طور پر بنے ہوں۔ اور یہ خیال ہمیں ہماری موجودہ کائنات کے تخیل سے کچھ بڑھ کر سوچنے کی راہ پر ڈالتا ہے۔

متعدد کائناتیں

کاسمولوجسٹوں یعنی کائنات کے مظاہر کا مطالعہ کرنے والوں کا خیال ہے کہ ہماری کائنات خود ایک اور بڑی کائنات کا ایک توسیعی حصہ ہے جسے کثیر الکائنات یا متعدد کائناتیں کہا جاتا ہے، یہ وہ مقام ہے جہاں کئی کائناتیں بیک وقت موجود رہتی ہیں لیکن ان کے درمیان کسی قسم کا کوئی رابطہ نہیں ہوتا۔ متعدد کائناتوں کے نظریے کو نظریۂ افراط سے بھی مدد ملتی ہے۔ یعنی یہ نظریہ کہ یہ کائنات اپنے وجود میں آنے کے فوراً بعد، جب یہ ایک سیکنڈ کے کھربویں حصے

کے برابر کے وقت جتنی پرانی تھی تو اُس لمحے یہ بہت ہی تیز رفتار سے پھیلی۔ کائنات کے افراط کا نظریہ بہت اہم ہے کیونکہ اس سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ کائنات کی جو بھی شکل وصورت ہمیں نظر آ رہی ہے یہ کس طرح تشکیل پائی تھی۔

لیکن کائناتی افراط صرف ایک مرتبہ ہو سکتا ہے، کئی مرتبہ کیوں نہیں؟ ہم اپنے تجربات کی روشنی میں یہ جانتے ہیں کہ مقدار (یعنی کوانٹم) کا اتار چڑھاؤ تیزی سے ظہور میں آنے والے ذرات کو جوڑوں کی صورت میں ابھرنے کا موقع فراہم کرتا ہے اور یہ دوسرے ہی لمحے معدوم ہو جاتے ہیں۔ اور اگر اس طرح کے اتار چڑھاؤ سے ذرات وجود میں آتے ہیں تو پھر پورے ایٹم یا کائناتیں کیوں نہیں؟ اس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ کائنات کی افراط کے لمحے کی افراتفری کے دوران ہر عمل ایک ہی رفتار کے ساتھ وقوع پذیر نہیں ہو رہا تھا۔ کائنات کی توسیع کے دوران کے کوانٹم اتار چڑھاؤ نے بلبلے بھی پیدا کیے ہوں گے جو پھٹنے کے بعد اپنی حیثیت کی کائناتیں بن گئیں ہوں گی۔

لیکن کائنات کے اس سارے پھیلاؤ کے عمل میں خدا کا تصور کہاں بیٹھتا ہے؟ کائنات کے علوم کے ماہرین کے لیے ایک حقیقت زیادہ دردِ سر رہی ہے کہ ہماری کائنات کیسے اُس توازن پر آ کر ٹھہری کہ اس میں زندگی وجود میں آ گئی۔ 'بِگ بینگ' میں وہ بنیادی ذرات پیدا ہوئے جن میں وہ خصوصیات تھیں جن کی بدولت ہائیڈروجن اور ڈیوٹیریم کے عناصر ظہور میں آئے۔ یہ وہ عناصر ہیں جن سے پہلے ستارے وجود میں آئے۔

ان ستاروں میں نیوکلیئری ری ایکشن کے عمل کو مربوط کرنے والے طبعی قوانین ایسا ماحول یا مادہ تشکیل دیتے ہیں جن کی وجہ سے زندگی وجود میں آتی ہے۔ کاربن، نائیٹروجن اور آکسیجن۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ کائنات میں تمام طبعی قوانین اور میعار وہ 'اقدار' رکھتے ہوں جو ستاروں اور سیاروں اور پھر آخر میں زندگی کو تشکیل دیتے ہیں؟

کچھ ماہرین کی رائے ہے کہ بس یہ ایک خوش قسمت حادثہ تھا۔ جبکہ دیگر ماہرین کہتے ہیں کہ ہمیں دنیا میں زندگی کے لیے سازگار ماحول بنانے والے طبعی قوانین کو دیکھ کر حیران نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بہرحال ہمیں وجود میں لانے کا سبب بنے ہیں، تو ہم اس میں اور کیا دیکھنا یا جاننا چاہتے ہیں؟ چند وہ ماہرین جو الوہیت پرحقین رکھتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ یہ مظاہر قدرت جنھوں نے (زندگی کے لیے) سازگار ماحول بنایا، یہ خدا کے وجود کا ثبوت ہیں۔

لیکن خود خدا کے وجود کے نظریے کی کوئی مستند سائنسی توضیح نہیں ہے۔ اس کی جگہ متعدد کائناتوں کا نظریہ اس پر اسرار خیال کا حل پیش کرتا ہے کیونکہ یہ نظریہ مختلف کائناتوں میں مختلف نوعیت کے طبعی قوانین کے امکان کو قبول کرتا ہے، اس لیے ہمیں حیران نہیں ہونا چاہیے ہم اُن کائناتوں میں سے ایک میں اپنے آپ کو دیکھتے ہیں جو زندگی کے لیے سازگار ماحول مہیا کرتی ہیں۔ بے شک آپ اس خیال کو مسترد نہیں کر سکتے کہ ان متعدد کائناتوں کو کسی ایک خدا نے تخلیق کیا ہوگا۔

یہ سب کچھ ایک مفروضہ ہے، اور متعدد کائناتوں کے نظریات کی ایک سب سے بڑی تنقید یہ ہے کہ چونکہ ایسا لگتا ہے کہ ہماری کائنات اور دیگر کائنات کے مابین کوئی باہمی تعلق موجود نہیں رہا ہے، اس لیے متعدد کائناتوں کے تصور کا براہ راست مشاہدہ نہیں کیا جا سکتا۔

کوانٹم کا انوکھا پن

اب آئیے غور کریں کہ کیا خدا بیک وقت ایک سے زیادہ جگہوں پر موجود ہو سکتا ہے۔ خلائی سائنس میں جو سائنس اور ٹیکنالوجی ہم زیادہ تر استعمال کرتے ہیں وہ ایٹم اور ذرات کی ننھی دنیا کے انسدادِ بدیہی (counter- intuitive) کے نظریہ پر مبنی ہے جسے کوانٹم میکینکس کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ نظریہ ایک ایسی چیز کو فعال سامنے لاتا ہے جسے کوانٹم انٹیگلمنٹ (یا مقداری الجھاؤ) کہا جاتا ہے: جو کہ بہت ہی پر اسراریت کے ساتھ آپس میں جڑے ہوئے ذرات ہوتے ہیں۔ اگر دو ذرات الجھے ہوئے ہیں، تو آپ خود بخود اس کے جوڑے کو کنٹرول کر لیتے ہیں جب آپ پہلے ایک کو کنٹرول کر لیتے ہیں، چاہے وہ بہت دور ہوں اور چاہے یہ دونوں ایک دوسرے سے تعامل نہ بھی کر رہے ہوں۔ اس الجھاؤ کی اس سے بہتر وضاحتیں بھی ہو سکتی ہیں جو میں نے یہاں دی ہیں۔ لیکن یہ سب سے آسان ہے جسے میں کچھ سمجھ سکتی ہوں۔ اب ذرا سوچیں کے ایک ذرا جو ٹوٹ کر A اور B میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ ان ذیلی ذرات کی خصوصیات کے لیے ضروری ہے کہ ان کا کل اصل ذرے کی خصوصیات کے برابر ہو۔ یہ تحفظ کا اصول (principle of conservation) کہلاتا ہے۔ مثال کے طور پر، تمام ذرات میں 'سپن' (چکر) نامی ایک کوانٹم پراپرٹی (مقداری خصوصیت) موجود ہوتی ہے۔ اگر اصل ذرے میں صفر کا 'سپن' ہے تو دو ذیلی ذرات میں سے ایک میں مثبت 'سپن' اور دوسرے میں منفی 'سپن' ہونا چاہیئے، جس کا مطلب ہے کہ A اور B میں سے ہر ایک میں مثبت ہونے کا پچاس فیصد امکان ہے، اور اسی طرح دوسرے میں منفی 'سپن' کا بھی پچاس فیصد امکان ہے۔

(کوانٹم میکانکس کے مطابق ذرات اپنی نوعیت کے لحاظ سے اصلی سطح یا ذیلی ذرات کا ملا جلا ایک مجموعہ ہوتے ہیں یہاں تک کہ آپ واقعی ان کی پیمائش کر لیں۔)

ذیلی ذرات A اور B کی خصوصیات ایک دوسرے سے آزاد نہیں ہیں۔ وہ آپس میں الجھی ہوئی ہیں۔ چاہے یہ الگ الگ سیاروں پر الگ الگ لیبارٹریوں میں ہی واقع کیوں نہ ہوں۔ اگر آپ A کی 'سپن' کی پیمائش کرتے ہیں اور آپ کو یہ مثبت معلوم ہوتی ہے تو پھر تصور کریں کہ کسی دوست نے B کی 'سپن' کو بالکل اسی وقت ماپا جس وقت آپ نے A کی پیمائش کی تھی۔ تحفظ کے اصول کے کام کرنے کے لیے اسے لازمی طور پر B کی 'سپن' کو تلاش کرنا چاہئے جو منفی ہو۔ لیکن یہیں سے چیزیں مبہم ہونا شروع ہو جاتی ہیں مطلب یہ کہ ذیلی ذرہ A کی طرح B میں بھی مثبت ہونے کا 50:50 فیصد کا امکان تھا، لہذا اس کی 'سپن' کی برقی حالت اس وقت منفی ہو گئی جب A کی 'سپن' کی حالت مثبت دیکھی گئی۔ دوسرے الفاظ میں 'سپن' کی حالت کے بارے میں معلومات دونوں ذیلی ذرات کے درمیان فوری طور پر منتقل ہو گئیں۔ کوانٹم معلومات کی اس طرح کی منتقلی بظاہر روشنی کی رفتار سے کہیں زیادہ تیز ہوتی ہے۔ اور اگر آئن سٹائن کو دو ذرات کے درمیان یہ تعلق حیران کن لگا تھا تو مجھے لگتا ہے کہ ہم سب کو اسے عجیب وغریب سمجھنے پر معاف کیا جا سکتا ہے۔

لہذا، یہاں کوئی ایسی شے ہے جو روشنی سے کہیں زیادہ تیز رفتار سفر کرتی ہے: اور وہ ہے کوانٹم کی معلومات۔ یہ بات خدا کے وجود کو نہ تو ثابت کرتی ہے نہ ہی مسترد کرتی

ہے۔لیکن یہ طبعی لحاظ سے خدا کے بارے میں سوچنے میں ہماری مدد کرسکتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ الجھے ہوئے ذرات کی بارش کی شکل میں ہو، جن میں کوانٹم کی معلومات آگے پیچھے منتقل ہوتی ہوں اور اسی طرح ایک ہی وقت میں بہت سے مقامات پر موجود ہوں۔ یہاں تک کہ ایک ہی وقت میں بہت سی کائناتوں میں بھی؟ میرے پاس خدا کا یہ تصور ہے کہ وہ سیارے کے سائز کی گیندوں کے کرتب دکھاتے وقت کہکشاں کے سائز کی پلیٹوں کو گھوما تا رہتا ہے اور معلومات ایک کہکشاں سے دوسری کہکشاں میں بھیجتا رہتا ہے تاکہ ہر شے حرکت میں رہے۔خوش قسمتی سے خدا ایک وقت کئی کام سرانجام دے سکتا ہے، یعنی ملٹی ٹاسک کرسکتا ہے اور جگہ اور وقت کے تانے بانے کا کام جاری رکھتا ہے۔اور اس کو سمجھنے کے لیے بس تھوڑے سے ایمان کی ضرورت ہے۔کیا یہ مضمون ان سوالات کے جوابات دینے میں کامیاب رہا ہے جو اٹھائے گئے تھے؟ مجھے شک ہے نہیں: اگر آپ خدا پر یقین رکھتے ہیں (جیسا کہ میں رکھتی ہوں) تو یہ خیال کہ خدا کو طبیعیات کے قوانین کا پابند ہونا چاہیئے ایک بے معنی خیال ہے، کیونکہ خدا ہر کام کرسکتا ہے، یہاں تک کہ روشنی سے بھی تیز سفر کرسکتا ہے۔اگر آپ خدا کو نہیں مانتے ہیں تو پھر بھی یہ سوال اتنا ہی غیر معقول ہے، کیوں کہ خدا نہیں ہے اور کوئی بھی چیز روشنی سے تیز سفر نہیں کرسکتی۔شاید واقعی یہ سوال ہی ان لوگوں کے لیے ہے جو ایسے عقیدے کے حامل ہیں کہ نہ ہم خدا کا علم رکھتے ہیں اور نہ ہی رکھ سکتے ہیں، ہم نہیں جانتے ہیں کہ خدا ہے یا نہیں۔دراصل یہ وہ مرحلہ ہے جہاں سائنس اور مذہب میں فرق پیدا ہوتا ہے۔ سائنس ثبوت مانگتی ہے جبکہ مذہب ایمان کا تقاضہ کرتا ہے۔سائنسدان خدا کے وجود کو ثابت کرنے یا اسے غلط ثابت کرنے کی کوشش نہیں کرتے، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ایسا کوئی تجربہ نہیں کیا جاسکتا ہے جس کے ذریعے خدا کا مشاہدہ کیا جاسکے۔اور اگر آپ خدا پر یقین رکھتے ہیں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے کہ سائنسدانوں نے کائنات کے بارے میں کیا دریافت کیا ہے۔کسی بھی کائنات کے بارے میں سوچا جاسکتا ہے کہ وہ خدا کے تصور کے مطابق چل رہی ہے۔

خدا کے بارے میں ہمارے نظریے کا، طبیعیات یا کسی بھی چیز کے حوالے سے، انحصار ہماری سوچ کے پس نظر پر ہوتا ہے یعنی اس خیال پر کہ کس زاویے سے بات ہورہی ہے۔ لیکن آیئے حقیقی معنوں میں مستند ذریعے کے ایک اقتباس پر اختتام کرتے ہیں۔نہیں نہیں، یہ بائبل نہیں ہے۔نہ ہی یہ کائنات کی درسی کتاب ہے۔یہ ایک مصنف ٹیری پرچیٹ کی کتاب 'ریپر مین' (Reaper Man) کا ایک اقتباس ہے:

'روشنی سوچتی ہے کہ وہ کسی بھی چیز سے زیادہ تیزی سے سفر کرتی ہے لیکن یہ غلط ہے۔روشنی کا سفر چاہے کتنا ہی تیز کیوں نہ ہو، اسے اندھیرا وہاں ہمیشہ پہلے سے موجود ملتا ہے اور اس کا منتظر ہوتا ہے۔'

❁❁❁

چشمہ لگانے والے افراد کے لیے اچھی خبر

چشمہ لگانے والے افراد کے لیے اچھی خبر ہے کہ اب امریکا نے 15 منٹ میں دھندلا پن سے نجات پانے اور صاف بینائی واپس لانے والی آئی ڈراپ بنا ڈالی۔

غیر ملکی میڈیا کے مطابق جمعرات کو مارکیٹ میں آنے والا ایک نیا منظور شدہ آئی ڈراپ لاکھوں امریکیوں کی زندگیوں کو بدل سکتا ہے جن کی عمر 40 یا اس سے زائد ہیں یا جو دھندلا پن کا شکار ہوں۔

کمپنی نے نزدیک کی نظر کمزور ہونے کا شکار افراد کے لئے 15 منٹ میں اثر دکھانے والی آئی ڈراپس متعارف کروادیں۔

ایف ڈی اے کی منظور شدہ آئی ڈراپس دونوں آنکھوں میں ایک ایک قطرہ 6 سے 10 گھنٹوں کے لئے دھندلا پن دور کرنے کے لئے کافی ہے۔

کمپنی کا کہنا ہے کہ کم روشنی یا رات کو گاڑی چلانے والے افراد کے لیے یہ قطرے موثر نہیں، جبکہ 65 سال کی عمر والے افراد بھی اس سے مستفید نہیں ہوسکتے۔

❁❁❁

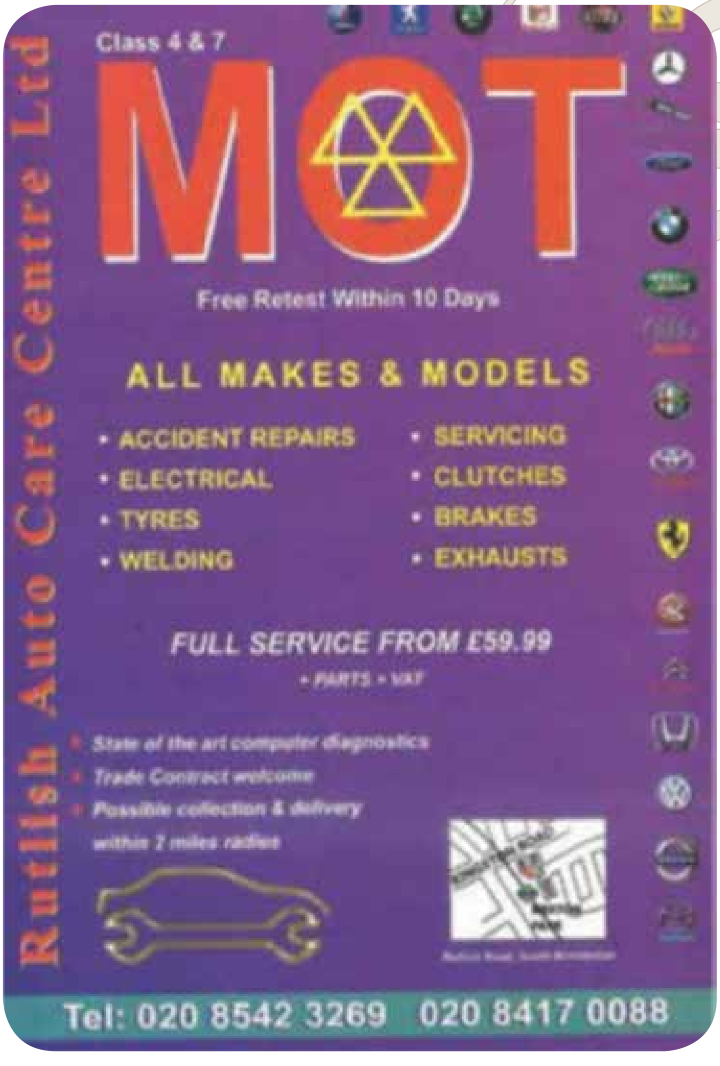

انسولین کے 100 سال اور ہمارا حال

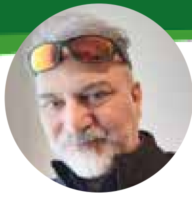

تحریر: ڈاکٹر طارق مرزا آسٹریلیا

قارئین کرام آج سے ٹھیک ایک صدی قبل کینیڈا کے ڈاکٹر بینٹنگ (Frederick Banting) اور ان کے شاگرد ڈاکٹر بیسٹ (Charles Best) نے پروفیسر جان میکلوڈ کی زیر نگرانی جانوروں کے لبلبے (Pancreas) سے انسولین کو "کشید" کر کے اس کا انجکشن تیار کرنے کا کارنامہ سرانجام دیا۔ انسولین ایک ایسا ہارمون ہے جس کی کلی یا جزوی کمی سے ذیابیطس شکری یعنی "شوگر" کا مرض لاحق ہو جاتا ہے۔

اس تاریخی کام کے لئے انہیں ہم وطن معروف بائیوکیمسٹ جیمز کولپ (James Collip) کی خدمات حاصل نہ ہوتیں تو انسولین کا صاف اور خالص انجکشن کبھی تیار نہ ہو پاتا۔ لیکن افسوس کہ جب اس پراجیکٹ کی کامیابی پر نوبل پرائز کا اعلان کیا گیا تو اس کا حقدار صرف جان میکلوڈ اور فریڈرک بینٹنگ کو قرار دیا گیا۔

معلوم ہوا کہ کسی نے ڈاکٹر بیسٹ اور جیمز کولپ کا نام نوبیل پرائز کمیٹی کو بھیجا ہی نہیں تھا۔ تاہم پروفیسر میکلوڈ نے انعام لینے کے بعد اپنی تقریر میں نہ صرف ان دونوں ساتھیوں کا خصوصی ذکر کیا بلکہ اپنے انعام کی آدھی رقم کولپ کو اور اسی طرح ڈاکٹر بینٹنگ نے اپنے انعام کی آدھی رقم ڈاکٹر بیسٹ کو ہدیہ کرنے کا اعلان بھی کیا۔

ڈاکٹر بیسٹ کو 1950 میں ذاتی طور پر ایک اور تحقیق کے نتیجہ میں الگ سے ایک نوبل پرائز سے بھی نوازا گیا۔ بہرحال ان چاروں سائینسدانوں کے لئے پیسہ کوئی وقعت نہیں رکھتا تھا۔ وہ تو محض انسانی خدمت کا جذبہ رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے انسولین انجکشن کا "پیٹنٹ" رسمی طور پر اپنے نام محفوظ کروانے کے معاً بعد محض ایک ڈالر میں یونیورسٹی آف ٹورانٹو کو ہبہ کر دیا۔ جانوروں پر ابتدائی کامیاب تجربوں کے بعد پہلی مرتبہ انسولین کا علاج شوگر کے جس مریض کے لئے شروع کیا گیا وہ ٹورونٹو ہسپتال میں داخل چودہ سالہ لڑکا لیئنرڈ تھامپسن (Leonard Thompson) تھا جو قریب المرگ ہو چکا تھا لیکن نو ایجاد شدہ انسولین انجکشن نے اس کی زندگی کو کئی سال مزید عطا کر دیئے، اس کی صحت بھی اچھی ہو گئی۔ ادھر آسٹریلیا میں سب سے پہلے انسولین 1923ء میں ایک چھ سالہ بچی کو شروع کروائی گئی جس کا نام فیلس ایڈمز (Phyllis Adams) تھا۔ اپنے جیسے پیدائشی ذیابیطس کے لاتعداد مریضوں کی طرح فیلس نے بھی بمشکل ایک دو سال مزید زندہ رہ کر مر جانا تھا لیکن انسولین انجکشن کی بدولت وہ طبعی عمر پا کر 81 برس زندہ رہی۔

1921 سے لے کے 2021 تک دم تحریر دنیا بھر میں ہزاروں نہیں، لکھوکھہا مریض انسولین کی بدولت صحتمند نارمل زندگی جی سکنے کے قابل ہوئے۔

آج بازار میں انسولین کی متعدد اقسام دستیاب ہیں۔ کچھ کا دورانیہ عمل 24 یا 36 گھنٹہ ہوتا ہے، کچھ محدود مدت کی اقسام ہیں جنہیں ہر کھانے سے معاً پہلے لگایا جاتا ہے۔ جبکہ کچھ انجکشن دونوں طرح کی انسولین پر مشتمل ہوتے ہیں جنہیں دن میں ایک بار ناشتے سے قبل لگایا جاتا ہے۔ انسولین پمپ بھی ایجاد ہو چکے ہیں، جنہیں مصنوعی لبلبہ بھی کہا جا سکتا ہے، ان کی جدید اقسام ایسی ہیں جو خود ہی خون میں شوگر لیول ٹیسٹ کرتی ہیں اور اس کے مطابق انسولین کی خوراک کا تعین کر کے مطلوبہ ڈوز جسم میں داخل کر دیتی ہیں۔ مریض کو بار بار بلڈ ٹیسٹ اور بار بار سرنج بھرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بچوں اور ناخواندہ افراد میں یہ پمپ بہت مفید ثابت ہوئے ہیں۔ اب تو جینیٹک انجنیئرنگ کے ذریعہ بیکٹیریا کی مدد سے بھی وافر مقدار اور کم قیمت میں انسولین تیار کی جاتی ہے جو انسانی انسولین کی طرح ہوتی ہے۔ اس سے کوئی الرجک ری ایکشن بھی نہیں ہوتا۔ کوشش کی جا رہی ہے کہ انسولین کا کوئی ایسا فارمولا تیار کیا جا سکے جو کیپسول یا گولی کی شکل میں ہو۔ یا زبان یا ناک میں سپرے کی شکل میں لیا جا سکے تا کہ ہر روز سوئیاں چبھونے سے جان چھوٹ جائے۔

اصل میں مسئلہ یہ ہے کہ انسولین ایک طرح کی پروٹین پر مشتمل ہوتی ہے اور اگر اسے نگلا جائے تو معدے اور آنتوں میں جا کر یہ دیگر پروٹین کی طرح ہضم ہو جاتی ہے اور خون میں اپنی سالم شکل میں پہنچ ہی نہیں پاتی۔ دنیا میں اب یہ تجربات بھی کئے جا رہے ہیں کہ جس طرح دیگر عطیہ شدہ اعضاء مثلاً آنکھیں، دل، جگر اور گردے وغیرہ ٹرانسپلانٹ کیئے جاتے ہیں، اسی طرح لبلبے میں موجود وہ غدود جو انسولین تیار کرتے ہیں ان کا بھی ٹرانسپلانٹ کیا جائے۔ اسی طرح ترقی یافتہ دنیا کے سائینسدانوں کی ایک بڑی تعداد اس بات پر بھی تحقیق کر رہی ہے کہ وہ مادے (Auto-Antibodies) جو پیدائشی طور پر لبلبے کے ان انسولین پیدا کرنے والے غدودوں کو ناکارہ کرنے کا باعث بنتے ہیں، (اور یوں شوگر کا مرض لاحق ہو جاتا ہے) ان مادوں کا ایسا توڑ نکالا جائے جو انہیں غیر مؤثر بنا دے، اور انسولین پیدا کرنے کے قدرتی عمل میں رخنہ اندازی ممکن نہ ہو سکے۔ اگر ایسا ہو گیا تو ماشاءاللہ انسولین کے ٹیکوں کی احتیاج باقی نہ رہے گی۔

بیشک، اللہ تعالیٰ نے انسان کو اتنی عقل عطا کی ہوئی ہے کہ وہ اپنے مسائل کا حل خود ڈھونڈ نکالے یا ایجاد کر لے۔ اس کے لئے اس مسبب الاسباب ذات نے وسائل بھی مہیا کر رکھے ہیں۔ پاکستان کے قومی شاعر علامہ اقبال نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا

تو شب آفریدی چراغ آفریدم　　سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی　　خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم　　من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

ترجمہ: تونے رات بنائی تومیں نے چراغ بنالیا، تونے مٹی بنائی اور میں نے پیالہ بنالیا۔تو نے صحرا، کہسار،اور خار وخس پیدا کئیے، میں نے ان میں عمدہ راستے، گلزار اور باغات بنا لئے۔میں وہ ہوں جو پتھر سے آئینہ بنا تا ہوں، میں وہ ہوں جو زہر سے تریاق بنالیتا ہوں۔

افسوس کہ آج اقبال کا کلام ایک طرف بھانڈوں کی جگتوں اور قوالوں کی تانوں کی نذر ہو کر دور خلامیں کہیں غائب ہوتا دکھائی دیتا ہے تو دوسری طرف متشدد دھرنوں میں مغلوب الغضب جبہ پوشوں کی فحش مغلظات کے ساتھ "ری مکس" ہو کر ریاست کے محافظوں کے خلاف پتھراؤ کی ہوئی خون آلو دا ینٹوں سے لپٹا سڑ کوں پہ گر انظر آتا ہے۔اناللہ۔۔۔

میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی!اور کتنابڑا ظلم ہے کہ کراچی سے لیکر چترال تک قسماقسم کے فٹ پاتھی حکیم "ایک ہفتہ میں انسولین سے نجات" کے بینر سجائے،ایک ہفتہ میں مریضوں کو انسولین نہیں بلکہ زندگی سے نجات دلاتے چلے جا رہے ہیں۔

عمران خان اور عارف علوی کی برطانوی اور امریکی ڈگریاں بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں!۔

❁❁❁

چین میں 'انڈے سے نکلنے کو تیار' ڈائنو سار کا فوسل دریافت

سائنسدانوں نے ایک ایسے ڈائنوسار ایمبریو کی دریافت کا اعلان کیا ہے جو بالکل کسی مرغی کے چوزے کی طرح انڈے سے نکلنے کو تیار تھا۔ یہ ایمبریو جنوبی چین کے شہر گینزھو میں دریافت ہوا ہے اور محققین کا اندازہ ہے کہ چھ کروڑ 60 لاکھ سال قدیم ہے۔ مانا جا رہا ہے کہ یہ بغیر دانتوں والا ایک تھیروپوڈیا اوویریپٹر سار ہے۔اس کا نام بے بی ینگلیا نگ رکھا گیا ہے۔ محقق ڈاکٹر فیئون ویسم مانے کہا 'یہ دریافت ہونے والا اب تک کا سب سے بہترایمبریو ہے۔' اس دریافت نے محققین کو ڈائنوسارز اور آج کے پرندوں کے درمیان تعلق کے بارے میں مزید معلومات فراہم کی ہیں۔فوسل میں دیکھا جا سکتا ہے کہ ایمبریو خم دار صورت میں تھا جسے 'ٹکنگ' کہا جاتا ہے۔پرندوں میں ایسا انڈے سے نکلنے سے عین پہلے دیکھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر مانے خبر رساں ادارے اے ایف پی کو بتایا کہ 'اس سے عندیہ ملتا ہے کہ جدید پرندوں کا یہ رویہ پہلے اُن کے ڈائنوسار آباؤ اجداد میں شروع ہوا اور پروان چڑھا۔' اوویریپٹر سارز یعنی انڈہ چور چھپکلیاں درحقیقت پروں والے ڈائنوسار تھے جو کریٹیشیئس دور کے اواخر یعنی 10 کروڑ سال قبل سے لے کر چھ کروڑ 60 لاکھ سال کے درمیان آج کے ایشیا اور برِاعظم شمالی امریکہ میں بستے تھے۔ اوویریپٹر سارز گروہ سے تعلق رکھنے والے ڈائنوسارز کی چونچ کی ساخت اور خوراک الگ الگ طرح کی ہوا کرتیں اور ان کی جسامت آج کے دور کے ٹرکی سے لے کر 26 فٹ لمبے جائیگینٹو سارز جتنی تک ہو سکتی تھی۔ معدوم ہو چکی حیاتیات کے ماہر پروفیسر سٹیو بروسیٹ بھی اس تحقیق کا حصہ تھے۔ اُنھوں نے ٹویٹ کی کہ یہ اُن کے دیکھے گئے 'سب سے حیران کُن ڈائنوسار فوسلز میں سے ایک' ہے،اور یہ کہ یہ ایمبریو بالکل انڈے سے نکلنے کے قریب تھا۔ ماہرین کا خیال ہے کہ اگر بے بی ینگلیا نگ پرورش پا جاتا تو دو سے تین میٹر لمبا ہوتا اور ممکنہ طور پر پودے کھاتا۔ محققین کے مطابق یہ جانور اندازاً سات کروڑ 20 لاکھ سال سے چھ کروڑ 60 لاکھ سال کے درمیان رہا کرتا تھا اور اچانک گرنے والے مٹی کے تودے نے اسے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔ بے بی ینگلیا نگ سر سے لے کر دم تک 10.6 انچ لمبا ہے اور یہ 6.7 انچ لمبے انڈے کے اندر موجود ہے۔اسے چین کے ینگلیا نگ سٹون نیچرل ہسٹری میوزیم میں رکھا گیا ہے۔ ویسے تو یہ انڈہ سنہ 2000 میں دریافت ہوا تھا مگر اسے 10 سال کے لیے سٹور یج میں رکھ دیا گیا۔ مگر جب میوزیم میں تعمیراتی کام شروع ہوا اور پرانے فوسلز کی ترتیب ہو رہی تھی تو محققین کی توجہ اس انڈے پر گئی جس کے بارے میں اُنھیں شک ہوا کہ اس میں ایک ایمبریو موجود ہے۔ ڈائنوسار کے جسم کا کچھ حصہ اب بھی پتھر سے ڈھکا ہوا ہے اور محققین اب جدید سکیننگ ٹیکنالوجی سے اس کے مکمل ڈھانچے کا خاکہ بنائیں گے۔ بیسویں صدی میں فوسلز پر تحقیق اور جینیاتی تجزیے کے بعد سائنسی برادری کا اس حوالے سے عمومی اتفاق ہے کہ آج کے دور کے پرندے ڈائنوسارز کی ہی نسل سے ہیں اور عام طور پر انھیں ڈائنوسارز کی طرح رینگنے والے جانوروں کے ہی عمومی گروہ میں رکھا جاتا ہے۔ آج کے پرندوں اور دیگر رینگنے والے جانوروں کی طرح ڈائنوسارز بھی انڈے دینے والے جانوروں میں سے تھے اور جراسک دور کے اواخر میں آج کے پرندوں کی ابتدائی شکل پرندوں والے ڈائنوسارز کی شکل میں سامنے آئی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ چھ کروڑ 60 لاکھ سال قبل ایک بہت بڑے شہابِ ثاقب کے زمین پر گرنے کے باعث ہونے والی تباہی سے بڑے ڈائنوسارز کا دنیا سے خاتمہ ہو گیا تھا تاہم پرندوں کی صورت میں ان کی نسل جاری رہی۔ ❁❁❁

امریکہ کا سب سے زیادہ آسیب زدہ ہوٹل؟

تحریر: رؤس کینتھ اُرکن

اس ایک صدی پرانے ہوٹل کے بارے میں افواہیں ہیں کہ یہاں محبت کی ماری ایک صفائی کرنے والی عورت کا بھوت رہتا ہے۔ شاید بے خیالی میں میں نے امریکہ کے ممکنہ طور پر سب سے زیادہ آسیب زدہ اور بدنام ہوٹل میں اپنے اور اپنے گھر والوں کے رہنے کا بندوبست کر دیا۔ اوکلاہوما شہر میں واقع یہ چودہ منزلہ ہوٹل 'دا سکروِن ہلٹن' ہے جو سنہ 1911 میں تعمیر کیا گیا تھا اور جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہاں ایفی کا بھوت پایا جاتا ہے۔ ایفی کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ 'پروہیبیشن ایرا' (وہ دور جب امریکہ میں شراب بنانے، فروخت کرنے اور درآمد کرنے کو آئین کے تحت ممنوع قرار دے دیا گیا تھا) کے زمانے میں اس ہوٹل میں کمروں کی صفائی کرنے والی ملازمہ تھی اور جس نے اس ہوٹل کے بانی ڈبلیو بی سکروِن کے ہاتھوں ناجائز طور پر حاملہ ہونے کے بعد چھلانگ لگا کر اپنی جان لی تھی۔ 'سکروِن' نامی کتاب کے شریک مصنف، سٹیو لیکمیئر، کا کہنا ہے کہ 'یہ پوری ریاست کی نہ سہی مگر اوکلاہوما سٹی کی سب سے مشہور بھوت کہانی ہے۔ آپ کو کچھ مشہور لوگ بھی یہ دعویٰ کرتے ملیں گے کہ انھوں نے ایفی کو شہوت انگیز حالت میں دیکھا ہے۔'

یہاں ٹھہرنے والے ایک مہمان بیٹا سینڈ یفورڈ آرٹسٹ کا کہنا ہے کہ 2016 میں جب وہ سکروِن میں تھے تو ایک عورت کے شہوت بھرے بھوت سے ان کا سامنا ہوا تھا۔ بعض دوسرے مہمان بھی ایسے دعوے کرتے ہیں۔ مگر یہاں رہنے والی ایک مصورہ پیٹرا اجرمنی کہتی ہیں کہ 'میرے خیال میں یہ آسیب زدہ نہیں ہے، بس بعض لوگ بزدل ہیں۔'

باتھ روم کے نم آئینوں پر 'ہیلپ می' کی تحریر

سکروِن کے ڈائریکٹر سیلز ڈون جیکسن نے بتایا کہ 'لوگ ہم سے کہتے ہیں کہ رات کو ان کی لائٹیں ٹمٹمانے لگتی ہیں یا الماری کا دروازہ دھڑام کر کے بند ہو جاتا ہے یا پھر دروازے سے چرچراہٹ کی آواز آتی ہے۔ شہر میں ہوٹل کے آسیب زدہ ہونے کے بارے میں کہانیاں مشہور ہیں، مگر ہم خود کو ان سے دور رکھتے ہیں کیونکہ ایسے کسی واقعے کا کوئی ثبوت نہیں ملا ہے۔' میں نے جیکسن کو بتایا کہ میری ایک مہمان سے بات ہوئی ہے جو یہاں پر کانفرنس میں شرکت کے لیے آئی تھی اور اس کے کسی ساتھی نے شاور کے بعد باتھ روم کے آئینے کی نم سطح پر 'ہیلپ می' (میری مدد کریں) کے الفاظ لکھے ہوئے دیکھے ہیں۔ ان کا جواب تھا: 'حال ہی میں ہمیں ایسی اطلاعات ملی ہیں کہ ایسے الفاظ آئینے پر ظاہر ہوئے ہیں۔'

ایفی کو چھوڑ کر بھی ہوٹل کا ماضی دلچسپ ہے۔ 1913 میں اس کے پہلے مینیجر نے خود کو گولی ماری تھی، یہ ایک خودکشی تھی بعد میں جس کی تفتیش قتل کے طور پر کی گئی۔ پھر ہوٹل کے اندر مسلح گروہوں میں جھڑپیں بھی ہو چکی ہیں۔ مگر دوسری جانب اس کے خاص مہمانوں میں امریکی صدور ڈوائٹ آئزن ہاور، ہیری ٹرومین اور رونالڈ ریگن بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ انگلش گلوکار و موسیقار پال میک کارٹنی اور امریکی گلوکار و اداکار ایلوِس پریسلی بھی یہاں ٹھہر چکے ہیں۔ جنرل مینیجر سکِپ ہارلس کہتے ہیں کہ 'دا سکروِن کی تاریخ اور شان و شوکت ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ یہاں جو ہوا اور یہاں پر ٹھہرنے والوں کے اثر سے یہ شاندار جگہ آسیب زدہ ہی محسوس ہوتی ہے۔'

یہاں کی لفٹ میں جب میری ملاقات ایک اور مینیجر کیسلی ہوبر سے ہوئی تو انھوں نے کہا: 'میں اس وقت تک یقین نہیں کرتی جب تک خود نہ دیکھ لوں۔' وہ تجہیز و تکفین کا بندوبست کرنے والے ایک گھرانے میں پلی بڑھی ہیں اور 10 سال سے یہاں پر کام کر رہی ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ انھیں یہاں کسی مافوق الفطرت حرکت کا کوئی ثبوت نہیں ملا ہے۔ مگر لفٹ سے نکلتے وقت انھوں نے کہا، 'کبھی نہیں، کبھی نہیں کہنا چاہیے۔'

اس عمارت کو بہتر طور پر سمجھنے کی غرض سے میں نے سوسن رائلی سے بات کی جو ہوٹل کی تاریخ کو اچھی طرح سمجھتی ہیں۔

وہ دعویٰ کرتی ہیں کہ اپنی ساڑھے چھ برس کی ملازمت میں انھوں نے شفٹوں کے دوران کسی بچے کے رونے کی آوازیں سنی ہیں، مگر بعد میں پتا چلا کہ جب دروازہ کھلنے پر اوکلاہوما کی تیز ہوا اندر داخل ہوتی ہے تو بچے کے رونے کی سی آواز پیدا ہوتی ہے۔

ہم ایک گولی کے نشان کی تلاش میں 10ویں منزل پر پہنچے جو مبینہ طور پر دو گروہوں کے درمیان لڑائی میں چلائی گئی تھی اور لفٹوں کے پاس لگی تھی، مگر ایسا کوئی نشان ڈھونڈنے میں ناکام رہے، اور جب 11ویں منزل پر گئے تو ایک دروازے پر آویزاں 'ڈونٹ ڈسٹرب' یعنی مُخل مت ہوں کی تختی اچانک سے پھڑ پھڑانے لگی، شاید دوازے کے نیچے سے آنے والی تیز ہوا کی وجہ سے۔ رائلی نے بتایا کہ کہا جاتا ہے کہ سرخ لباس پہنے ہوئے ایک عورت کا ہیولا بھی کبھی کبھار کوریڈور میں نظر آتا ہے۔

اپنے انگوٹھے اور انگلی کو بجا کر آواز نکالتے ہوئے رائلی نے کہا کہ 'یہاں کے ماحول میں آواز گونجتی ہے۔' ایک بڑے ہال میں جا کر انھوں نے بتایا کہ وہ یہاں کئی ضیافتوں کا اہتمام کر چکی ہیں۔ 'آسیب یہاں پر سب سے زیادہ سرگرم لگتا ہے کیونکہ ضیافت کے بعد اگلی صبح یہاں پر سامان بری طرح سے بکھرا ہوا پایا گیا ہے۔' ان کے خیال میں ایسا حالیہ دور میں آنے والے زلزلے کے جھٹکوں کی وجہ سے ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر برائن فرہا وکلا ہوما سٹی یونیورسٹی میں مابعد طبیعیات کے پروفیسر ہیں اور اس موضوع پر کتاب بھی لکھ چکے ہیں۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ 2004 میں وہ بھوتوں کی تلاش میں داسکرونِ میں جا چکے ہیں۔

بھوت کی ہنسی

ان کا کہنا تھا کہ 'میں نے یہاں کا چپہ چپہ چھان مارا مگر مجھے ایسی کوئی چیز نہیں ملی۔ اور یہ میں نے انتہائی پراسرار ماحول میں کیا، جب ہوٹل کی تزئین و آرائش نہیں ہوئی تھی، بجلی بند ہو جانے کی وجہ سے انتہائی سردی تھی اور دیکھنے کے لیے فلیش لائٹس کا سہارا لینا پڑا تھا۔ پھر بھی سوائے ایک پرانے، خالی اور ٹھنڈے ہوٹل کے کچھ نہیں ملا۔' جب میری بیوی نے شکایت کی کہ اسے بعض راتوں کو بھوت کے ہنسنے کی آواز آتی ہے تو میں نے ٹانیا میکلوئے کو بلایا جو بھوت پکڑتی (عامل) ہیں۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ ہمارے کمرے میں آئیں۔ میکلوئے نے کہا: 'تم نیچے سیڑھیوں کی لکڑی پر اپنا ہاتھ رکھو اور اس میں موجود جان کو محسوس کرو۔ یہ پاگل کرنے والی ہے۔' میکلوئے نے اپنے فون پر کسی ایپ کی مدد سے بچوں کی گاڑی پر سے ایک سبز چھڑی کی تصویر لی جو آنکھ سے نظر نہیں آ رہی تھی۔ میری بیٹی برابر والے کمرے میں سو رہی تھی۔ میکلوئے نے اپنی مختلف ایپس کو احتیاط سے کھولا اور بند کیا کیونکہ ان کے سیدھے ہاتھ کی چھوٹی انگلی اس وقت مڑ گئی تھی جب بقول ان کے 'ایک بھوت نے انھیں دھکا دے دیا تھا۔' انھوں نے کچھ برقیاتی آلات بھی استعمال کیے جو مقناطیسی لہروں اور حرارت معلوم کرنے کے لیے کام میں لائے جاتے ہیں۔ انھوں نے راہداری میں اپنے فون کے ذریعے روحوں کو ڈھونڈنے کی بھی کوشش کی۔ اس دوران ان کے شوہر ایک 'گوسٹ ہنٹِنگ ٹولز' (بھوت پکڑ آلہ) نامی ایپ ہاتھ میں لیے ہوئے ان کے پیچھے چل رہے تھے، اور ان کے بقول اگر کوئی بھوت راستے میں ہو تو وہ ٹیکسٹ میسج کے ذریعے رابطہ کرتا ہے۔

ایک بھوت کا سراغ

گوسٹ ہنٹنگ ٹولز ایپ پر پیغام آیا، 'باہر نکل جاؤ'۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی کی ایک لہر آ کر گزر گئی۔ ہم بھوت کی تلاش میں راہداری میں آگے بڑھے تو گرمی کی ایک لہر سی آئی۔ کیا یہ گرم ہوا کا کوئی جھونکا تھا؟ جب ہم لفٹ کی طرف جا رہے تھے تو میکلوئے نے کہا: 'یہ بھوت ہے، بڑا والا۔' اور یہ کہ ان کے سر سے نیچے تک ان پر کپکپی طاری ہوئی اور اپنے بازو پر کھڑے رونگٹے مجھے دکھائے۔ گوسٹ ہنٹنگ ٹول سکرین پر 'سیٹ' لکھا ہوا نظر آیا۔ میکلوئے نے مجھ سے کہا کہ وہ ایک 20 سے 30 سال کی عمر کا نوجوان تھا جس کا نام چارلس تھا اور جو لفٹ کے برابر رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ انھوں نے کہا کہ وہ ایک ٹھیکے دار تھا اور یہ کہ اسے دیکھ کر انھیں اپنی سر کی پچھلی جانب درد محسوس ہوا، جو بقول ان کے اس وجہ سے تھا کہ بھوت اپنے مرنے کے حالات زندوں پر آشکار کرنے کے لیے ایسا کرتے ہیں۔ راہداری میں واپس آتے ہوئے دوسرا ٹھنڈا مقام آیا۔ میں نے جھرجھری سی لی، اور میکلوئے کے بازو پر رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے ایک دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: 'یہ 813 سے آ رہی ہے۔' اپنی نوٹ بک پر پین رکھتے ہوئے میں کافی بے چین ہو چکا تھا اور فیصلہ کر لیا تھا کہ کہہ دوں کہ 'بہت ہو چکی'، کہ ایپ پر 'پین' کا لفظ ابھرا۔ میکلوئے نے 'تمھاری ڈھال ایک بوتل میں' کہتے ہوئے عطر جتنی ایک شیشی اور کچھ جڑی بوٹیاں مجھے پکڑا دیں۔ وہ رات میں نے اپنی بیوی اور بیٹی کی نگرانی کرتے گزاری۔ کمرے میں لگی گھڑی سے نکلنے والی روشنی عجیب و غریب منظر بنا رہی تھی اور میں چارلس اور ایفی کی موجودگی کا سراغ پانے کے لیے پوری طرح سے چوکنا تھا۔

❁❁❁

چراغ زندگی ہو گا فروزاں ہم نہیں ہوں گے

(عبدالمجید سالک)

چراغ زندگی ہوگا فروزاں ہم نہیں ہوں گے
چمن میں آئے گی فصل بہاراں ہم نہیں ہوں گے
جوانو اب تمہارے ہاتھ میں تقدیر عالم ہے
تمہیں ہوگے فروغ بزم امکاں ہم نہیں ہوں گے
جئیں گے جو وہ دیکھیں گے بہاریں زلف جاناں کی
سنوارے جائیں گے گیسوئے دوراں ہم نہیں ہوں گے
ہمارے ڈوبنے کے بعد ابھریں گے نئے تارے
جبین دہر پر چھٹکے گی افشاں ہم نہیں ہوں گے
نہ تھا اپنی ہی قسمت میں طلوع مہر کا جلوہ
سحر ہو جائے گی شام غریباں ہم نہیں ہوں گے
اگر ماضی منور تھا کبھی تو ہم نہ تھے حاضر
جو مستقبل کبھی ہوگا درخشاں ہم نہیں ہوں گے
ہمارے دور میں ڈالیں خرد نے الجھنیں لاکھوں
جنوں کی مشکلیں جب ہوں گی آساں ہم نہیں ہوں گے
کہیں ہم کو دکھا دو اک کرن ہی ٹمٹماتی سی
کہ جس دن جگمگائے گا شبستاں ہم نہیں ہوں گے
ہمارے بعد ہی خون شہیداں رنگ لائے گا
یہی سرخی بنے گی زیب عنواں ہم نہیں ہوں گے

پراگ اگروال

آخر انڈین نژاد سی ای اوز سیلیکون ویلی پر راج کیسے کر رہے ہیں؟

پراگ اگروال کو اسی ہفتے ٹوئٹر کے سی ای او کے طور پر مقرر کیا گیا ہے جس کے ساتھ وہ دنیا کی سب سے بااثر سیلیکون ویلی کمپنیوں کے ان درجن بھر سربراہوں میں شامل ہو گئے ہیں جن کا تعلق انڈیا سے ہے۔ اب وہ مائیکروسافٹ کے ستیہ نڈیلا ہوں یا الفابیٹ (گوگل) کے سندر پچائی یا پھر آئی بی ایم، اڈوبی، پالو آلٹو نیٹورکس، وی ایم ویئر اور ویمو جیسی کمپنیاں ہوں، سب کے سربراہان انڈین نژاد ہیں۔ اگرچہ انڈین نژاد امریکی آبادی کا صرف ایک فیصد ہیں لیکن سیلیکون ویلی کی افرادی قوت کا وہ چھ فیصد ہیں۔ تو پھر وہ سیلیکون ویلی میں اعلیٰ عہدوں پر کیسے پہنچ جاتے ہیں؟ ٹاٹا سنز کے سابق ایگزیکٹو ڈائریکٹر اور 'دی میڈ ان انڈیا مینیجر' کے شریک مصنف آر گوپال کرشنن کہتے ہیں: 'دنیا میں کوئی دوسرا ملک اتنے زیادہ شہریوں کو اتنے مقابلہ جاتی انداز میں 'تربیت' نہیں دیتا جتنا کہ انڈیا دیتا ہے۔' مشہور انڈین کارپوریٹ سٹریٹیجسٹ سی کے پرہلاد کے حوالے سے وہ مزید کہتے ہیں کہ 'برتھ سرٹیفکیٹ سے لے کر موت کے سرٹیفکیٹ تک، سکول میں داخلے سے لے کر نوکری حاصل کرنے تک، بنیادی ڈھانچے کی کمیوں سے لے کر ناکافی سہولیات تک کی جدوجہد کے ساتھ انڈیا میں پروان چڑھنے والے انڈینز کو 'قدرتی مینیجرز' بنا دیتا ہے۔' دوسرے لفظوں میں کہیں تو آگے بڑھنے کے مقابلے اور افراتفری کے درمیان وہ فطری طور پر مسائل کے حل سے مطابقت پیدا کرنے والے بن جاتے ہیں۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ درحقیقت وہ امریکہ کے کام کے دباؤ والے دفتری ماحول میں اکثر پیشہ ورانہ افراد کو ذاتی تعلقات والے لوگوں پر ترجیح دیا جاتا ہے۔ مسٹر گوپال کرشنن کہتے ہیں کہ 'یہ دنیا بھر میں کہیں بھی سرکردہ لیڈران کی خصوصیات ہیں۔' انڈین نژاد سیلیکون ویلی کے سی ای او بھی ان چالیس لاکھ مضبوط اقلیتی گروپ کا حصہ ہیں جو امریکہ میں سب سے امیر اور سب سے زیادہ تعلیم یافتہ ہیں۔ ان میں سے تقریباً 10 لاکھ سائنسدان اور انجینیئر ہیں۔ 70 فیصد سے زیادہ ایچ-ون بی ویزے جو امریکہ جاری کرتا ہے وہ انڈین سافٹ ویئر انجینیئروں کو جاتے ہیں۔ یہ ویزے امریکہ میں بیرون ممالک کے لوگوں کو کام کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ سیئٹل جیسے شہروں میں تمام غیر ملکی پیدا ہونے والے انجینیئروں میں سے 40 فیصد انڈینز ہیں۔ 'دی ادر ون پرسنٹ: انڈینز ان امریکہ' کے مصنفین لکھتے ہیں کہ 'اس کا سبب سنہ 1960 کی دہائی میں امریکہ کی امیگریشن پالیسی میں آنے والی بڑی تبدیلی ہے۔ شہری حقوق کی تحریک کے نتیجے میں، نیشنل-اوریجن کوٹوں کو ہنر اور خاندانی اتحاد کو ترجیح دینے سے بدل دیا گیا۔ اس کے فوراً بعد پہلے اعلیٰ تعلیم یافتہ انڈین جن میں سائنسدان، انجینیئر اور ڈاکٹرز وغیرہ شامل تھے وہ امریکہ پہنچے اور پھر بڑی تعداد میں، سافٹ ویئر پروگرامرز امریکہ پہنچنے لگے۔ مصنفین کا کہنا ہے کہ انڈین تارکین وطن کا یہ گروہ 'کسی دوسری قوم کے کسی دوسرے تارکین وطن گروپ سے مشابہت نہیں رکھتا تھا۔' وہ تین طرح سے 'قابل انتخاب' تھے، نہ صرف وہ اعلیٰ ذات کے مراعات یافتہ انڈینز میں سے تھے جو کسی اہم اور معروف کالج میں جانے کی استطاعت رکھتے تھے، بلکہ ان کا تعلق اس ایک چھوٹے طالب علموں کے طبقے سے بھی تھا جو امریکہ میں ماسٹرز کی ڈگری کا مالی بوجھ برداشت کر سکتے تھے اور سیلیکون ویلی کے بہت سے سی ای اوز کے پاس یہ ڈگریاں ہیں۔ اور ویزا سسٹم کا مخصوص مہارتوں کے حامل افراد تک محدود ہونا موثر رہا جس میں اکثر سائنس، ٹیکنالوجی، انجینیئرنگ اور ریاضی یا سٹیم میں ترجیحی زمرہ کے طور پر جانا جاتا ہے، جو امریکہ کی 'اعلیٰ درجے کی لیبر مارکیٹ کی ضروریات' کو پورا کرتا ہے۔ ٹیکنالوجی کے کاروباری اور تعلیمی ماہر ویویک وادھوا کہتے ہیں کہ 'یہ وہ بالائی طبقہ ہے جو ایسی کمپنیوں میں شامل ہو رہا ہے جہاں وہ ترقی کر کے بلند ترین مقام پر پہنچتے ہیں۔ انھوں نے (سیلیکون ویلی میں) جو نیٹ ورک تیار کیا ہے اس سے بھی انھیں ایک فائدہ پہنچا ہے۔ اس نیٹ ورک کے پس پشت ایک دوسرے کی مدد کا تصور کارفرما تھا۔' مسٹر وادھوا نے مزید کہا کہ انڈیا میں پیدا ہونے والے بہت سے سی ای اوز نے کمپنی میں اوپر جانے کے لیے محنت کی ہے۔ اور ان کا خیال ہے کہ ان کی عاجزی اور انکساری ان کو اس مقام تک لے جانے کے لیے، بہت سے بانی سی ای اوز سے ممتاز کرتی ہے جن پر متکبر اور حقدار ہونے کا الزام لگایا جاتا ہے۔ مسٹر وادھوا کا کہنا ہے کہ نڈیلا اور پچائی جیسے لوگ ایک خاص مقدار میں احتیاط اور ایک قسم کے 'نرم' کلچر کی عکاسی کرتے ہیں جو انھیں اعلیٰ ملازمت کے لیے مثالی امیدوار بناتا ہے، خاص طور پر ایسے وقت میں جب کانگریس کی سماعتوں، دوسرے ممالک کی حکومتوں کے ساتھ جاری تنازعات اور سیلیکون ویلی کے مقابلے باقی امریکہ کے درمیان بڑھتے ہوئے خلیج کے دوران بڑی ٹیکنالوجی کمپنیوں کی ساکھ گر رہی ہو۔ بلومبرگ نیوز کے لیے انڈیا میں ٹیک انڈسٹری کی کوریج کرنے والی صحافی سریتھا رائے کہتی ہیں کہ ان کی 'مدھم اور غیر مخروش قیادت' بہت بڑی افادیت ہے۔ انڈیا نژاد امریکی ارب پتی تاجر اور وینچر کیپیٹلسٹ اور سن مائیکروسسٹم کے شریک بانی ونود

کھوسلہ کا کہنا ہے کہ بہت ساری رسوم و رواج اور زبانیں، انڈیا کا متنوع معاشرہ 'انھیں (انڈیا پیدا ہونے والے مینیجرز) کو پیچیدہ حالات میں کام کرنے کی صلاحیت بخشتی ہیں، خاص طور پر جب بات تنظیموں کی آزمائشوں کی ہو۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ 'یہ اور اس کے علاوہ ان کی 'محنت کی اخلاقیات انھیں اچھی طرح سے اس کام کے لیے تیار کرتی ہے۔

اس کے علاوہ مزید ظاہرو جوہات بھی ہیں۔ بہت سارے انڈینز کا اچھی طرح سے انگریزی بولنا ان کے متنوع امریکی ٹیک انڈسٹری میں ضم ہونے کو آسان بناتا ہے۔ اور انڈیا میں تعلیم کے نظام میں ریاضی اور سائنس پر زور نے ایک فروغ پذیر سافٹ ویئر انڈسٹری کو جنم دیا ہے، طلبہ کو صحیح ہنر کی تربیت دی ہے، جسے امریکہ کے اعلیٰ انجینیئر نگ یا مینجمنٹ سکولوں اور کالجوں میں مزید نکھارا جاتا ہے۔

روپا سبرامنیا نے حال ہی میں فارن پالیسی میگزین میں لکھا کہ 'دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ امریکہ میں انڈین نژاد سی ای اوز کی کامیابی اس بات پر بھی منحصر ہے کہ امریکہ کو کیا صحیح ہے چاہیے، یعنی جو نائن الیون سے پہلے کم از کم صحیح ہوا کرتا تھا وہ بعد میں امیگریشن کی سختی کے بعد محدود ہو گیا۔ امریکی گرین کارڈز کے لیے درخواستوں میں بہت زیادہ بیک لاگ اور انڈین مارکیٹ میں بڑھتے ہوئے مواقع نے یقینی طور پر بیرون ملک کیریئر کی رغبت کو مدھم کر دیا ہے۔ رائے کہتی ہیں: 'امریکی خواب کی جگہ اب انڈیا میں سٹارٹ اپ خواب دیکھنے کو مل رہا ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ انڈیا میں 'یونیکورن کمپنیوں کا حالیہ ظہور جن کی مالیت ایک ارب ڈالر سے زیادہ وہ یہ بتاتی ہیں کہ ملک میں بڑی ٹیک کمپنیاں تیار ہونا شروع ہو گئی ہیں۔ لیکن، وہ کہتے ہیں، یہ بتانا ابھی قبل از وقت ہے کہ ان کے عالمی اثرات کیا ہوں گے۔ کھوسلا کہتے ہیں کہ 'انڈیا کا سٹارٹ اپ ایکو سسٹم نسبتاً کم عمر ہے۔ کاروباری اور ایگزیکٹو دونوں صفوں میں کامیاب انڈینز کے رول ماڈلز نے بہت مدد کی ہے لیکن رول ماڈل کو پھیلنے میں وقت لگے گا۔ ماہرین کا یہ بھی کہنا ہے کہ زیادہ تر رول ماڈل مرد ہی ہیں، جیسا کہ سیلیکون ویلی کے سی ای اوز کی فہرست میں دیکھا جا سکتا ہے کہ تقریباً تمام مرد ہیں۔ اور ان کے کیریئر میں تیزی سے اضافہ صنعت سے مزید تنوع کی توقع کرنے کی کافی وجہ نہیں ہے۔ رائے کہتی ہیں: 'خواتین کی نمائندگی (ٹیکنالوجی کی صنعت میں) کہیں بھی اس کے آس پاس بھی نہیں ہے جو اسے ہونی چاہیے۔ (بشکریہ بی بی سی)

❁❁❁

دنیا کا سب سے بڑا نیلم نمائش کے لیے پیش

کولمبو: سری لنکا میں دنیا کا سب سے بڑا نیلم کا پتھر نمائش کے لیے پیش کر دیا گیا، 310 کلوگرام وزنی پتھر کو ملکہ ایشیا قرار دیا گیا ہے۔

دنیا بھر میں پائے جانے والے نیلم کے تمام پتھروں میں سے تقریباً 90 فیصد سری لنکا کے ہیں جو اپنی منفرد ساخت کی وجہ سے مشہور ہیں۔

اس نیلم کو کولمبو سے 65 کلومیٹر جنوب میں ہورانا میں ایک جوہر کے مالک کے گھر نمائش کے لیے رکھا گیا تھا، قیمتی پتھر تین ماہ قبل رتناپورہ کے ماہرین نے دریافت کیا تھا۔

رتناپورہ کو جنوبی ایشیائی ملک کے جواہرات کے دارالحکومت کے طور پر جانا جاتا ہے، جو نیلم اور دیگر قیمتی جواہرات کا سب سے بڑا برآمد کنندہ ہے۔ ہیروں کے معروف ماہر ڈاکٹر جمینی زویسا کا کہنا ہے کہ محتاط اندازوں کے مطابق یہ پتھر شاید 40 کروڑ سال پہلے بنا ہو گا۔

سری لنکا نے گزشتہ سال جواہرات، ہیروں اور دیگر زیورات کی برآمد سے تقریباً نصف ارب ڈالر کا بزنس کیا تھا۔

❁❁❁

’فانس‘ سے ’فانوس‘ بننے کا سفر شفاف شیشوں کے طفیل

تحریر: عبد الخالق بٹ

فانوس بن کے جس کی حفاظت ہوا کرے
وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے

شعر بالا نامعلوم شاعروں کے مقبول عام اشعار میں سے ایک ہے، شعر کا پہلا لفظ ’فانوس‘ ہے، جس کی خوبی یہ ہے کہ اس کے ذکر سے ہی فانوسِ خیال بھی روشن ہوجاتا ہے۔ قبل اس کے کہ لفظ ’فانوس‘ پر روشنی ڈالیں، یہ سمجھ لیں کہ ’فانوس‘ شیشے کا بنا ہوا شمع پوش ہوتا ہے، جس میں کبھی شمع جھلملاتی تھی اور اب برقی قمقمے جگمگاتے ہیں۔ اوقیانوس اور دقیانوس کی طرح ’فانوس‘ بھی یونانی زبان کا لفظ ہے، ماہرین زبان کے مطابق ’فانوس‘ کا اصل لفظ ’فانس‘ ہے، ’فانس‘ کے معنی ’شفاف‘ کے ہیں۔ ’فانس‘ سے ’فانوس‘ بننے کا سفر ان شفاف شیشوں کے طفیل ہے، جن کی شفافیت شمع کی روشنی بڑھاتی ہے۔

درج بالا شعر میں ایک لفظ ’ہوا‘ بھی ہے، اس ہوا کی اصل سنسکرت کا وایو/ वायु ہے، جو پنجابی میں پہنچ کر ’وا‘ رہ گیا ہے، تاہم اپنی اصل سے قریب ہے۔

خیر ’ہوا‘ فارسی اور ترکی زبان میں بھی ’ہوا‘ ہی ہے، چوں کہ جہاز ہوا کے دوش پر اُڑتا ہے اس لیے ایئرلائن کو ترکی زبان میں ’ہوا یولری‘ کہتے ہیں۔

اردو میں ’ہوا‘ سے ’ہوائی جہاز‘ کی ترکیب ہے، مگر عربی نے اس جہاز کا تعلق ’ہوا‘ سے جوڑنے کے بجائے ہوا میں اڑتے پرندے سے جوڑا ہے۔ یوں عربی میں پرندہ اگر طائر ہے ہوائی جہاز طیارہ ہے۔ پھر ہوائی جہاز سے متعلق پرندے کا تصور صرف عربی تک محدود ہے، اس لیے کہ فرانسیسی زبان ہوائی جہاز کے لیے مستعمل لفظ avion کا جُز اول avi لاطینی زبان کا ایوس (avis) ہے، جس کے معنی پرندے کے ہیں۔ پھر اسی ایوس کو آپ کو فرانسیسی ایوی اوں کے علاوہ انگریزی کے ایوی ایشن میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔

خیر عربی اور فرانسیسی میں پرندے کی نسبت سے ہوائی جہاز کے لیے طیارہ اور ایوی اوں کا لفظ انوکھی بات نہیں ہے۔ اس لیے کہ دنیا میں انسانوں کا مظاہر فطرت کے حوالے سے مشاہدہ ہمیشہ ایک سا رہا ہے۔ اس بات کو انگریزی محاورے birds of a feather flock together سے بھی سمجھا جا سکتا ہے، جو فارسی میں ’کند ہم جنس بہ ہم جنس پرواز، کبوتر بہ کبوتر باز بہ باز‘ کا مفہوم لیے ہوئے ہے۔

ترکی اور فرانسیسی زبان کے ذکر کے ساتھ اب لفظ ’بُغچہ‘ پر غور کریں۔

اردو میں ’بُغچہ‘ کپڑوں کی گٹھری کو کہتے ہیں، اردو میں یہ لفظ ترکی زبان سے آیا ہے، ترکی میں اس کی صورت ’بُقچہ‘ ہے، یعنی اس میں حرف ’قاف‘ ہے، جو صوتی تبدیلی کے زیر اثر اردو میں ’غین‘ ہو کر ’بُغچہ‘ ہوگیا ہے۔ یہ ایسے ہی جیسے ترکی کا ’آقا‘ فارسی میں لکھا تو ’آقا‘ ہی جاتا ہے، مگر پڑھا ’آغا‘ جاتا ہے۔

خیر ذکر تھا ’بُقچہ‘ کا جو اردو میں ترکی کی راہ سے آیا اور ترکی میں فرانسیسی زبان سے داخل ہوا، فرانسیسی میں یہ لفظ بیگژ (bagages) ہے اور صندوق کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، پھر یہی bagag-es تلفظ میں معمولی تبدیلی کے ساتھ انگریزی بیگج (baggage) ہوگیا ہے۔ بر سبیل تذکرہ عرض ہے کہ ملک فرانس کے نام کو فرانک قوم سے نسبت ہے، اس جرمن قوم نے جب گال کا علاقہ فتح کیا، تو وہ ان کی نسبت سے فرانسیا یعنی فرانک لوگوں کا ملک کہلایا۔ جو بعد میں فرانس ہوگیا۔ یہی فرانک فارسی میں فرنگ اور عربی میں افرنج ہے۔

اول اول فرنگ سے فرانسیسی باشندہ مراد لیا جاتا تھا بعد میں اس فرنگ کے معنی میں وسعت پیدا ہوئی اور کُل یورپی اقوام اس میں داخل ہوگئیں اور فرنگی کہلائیں۔ اس بات کو علامہ اقبال کے شعر سے سمجھیں، جنھوں نے فرنگ کہہ کر یورپ مراد لیے ہیں:

ڈھونڈ رہا ہے فرنگ عیش جہاں کا دوام
وائے تمنائے خام، وائے تمنائے خام

ویسے کتنی عجیب بات ہے کہ فرانس میں جرمن قوم آباد ہے اور انگلستان میں فرانسیسی قبیلہ بستا ہے، اور اس انگل قبیلے کی نسبت یہ علاقہ انگلینڈ اور ان کی زبان انگلش کہلاتی ہے۔ یہی انگلینڈ اور انگلش اردو میں انگلستان کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔

❁❁❁

افغانستان میں غربت کے باعث والدین اپنی بچیاں فروخت کرنے پر مجبور

کابل: جنگ سے زخم خوردہ افغانستان میں غربت اور بھوک کے باعث والدین اپنے بچوں اور بچیوں کو فروخت کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔

عالمی خبر رساں ادارے ''اے ایف پی'' کی ایک رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ دو دہائیوں سے جنگ جھیلنے والے افغانستان میں اب حالات مزید ابتر ہو گئے ہیں غربت، بھوک اور افلاس کی وجہ سے والدین نے اپنے کم سن بچوں اور بچیوں کو فروخت کرنا شروع کر دیا ہے تاکہ خاندان کے دیگر افراد کی شکم کی آگ بجھا سکیں۔

اے ایف پی کے نمائندوں نے صوبے بدغیث کے دارالحکومت قلعہ نو کے پناہ گزین کیمپ دورہ کیا اور کیمپوں میں رہنے والے پناہ گزینوں سے ملاقاتیں کی۔ یہ انہی لوگوں کی دکھوں کی درد بھری داستان ہے۔

بچیوں کے والد نے روتے ہوئے بتایا کہ بڑی بیٹی کی 3 ہزار 350 ڈالر اور چھوٹی بیٹی کی 2 ہزار 800 ڈالر کے عوض شادی طے کی ہے۔ دونوں دلہا بھی ابھی کم سن ہیں۔

دکھ، شرمندگی اور ندامت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ بے بس والد نے مزید بتایا کہ یہ رقم دلہا کے والدین ہمیں ابھی قسطوں میں ادا کر رہے ہیں جس سے گھر کا خرچہ چل رہا ہے جیسے ہی رقم پوری ہو جائے گی بیٹیوں کو رخصت کر دیں گے۔

فہیمہ نے شوہر کو دلاسہ دیتے ہوئے بتایا کہ اگر اُن کے شوہر نے ایسا نہیں کرتے تو ہم سب ہی ایک ایک کر کے بھوک سے مر جاتے۔

بھوک و افلاس سے شدید متاثرہ صوبے بدغیث کے دارالحکومت میں صرف فہیمہ ہی بدقسمت نہیں، پڑوسی 25 سالہ بیوہ صبیرہ پر پرچون کی دکان والے کا قرضہ چڑھ گیا اور دکاندار نے قرضہ ادا نہ کرنے کی صورت میں جیل بھیجنے کی دھمکی دینے لگا۔

اب بیوہ خاتون صبیرہ کے پاس اب کوئی اور راستہ نہیں بچا تھا کہ وہ اپنی 3 سالہ بیٹی زخیرح کو دکاندار کے 4 سالہ بیٹے ذبیح اللہ کے نکاح میں دیدے۔ رخصتی دونوں کے بالغ ہونے پر ہو گی اور تب تک بیوہ خاتون کو دکان سے اجناس ملتا رہے گا۔

اپنے نصیبوں کو کوستی بیوہ خاتون نے 'اے ایف پی' کو بتایا کہ مجھے یہ بالکل بھی اچھا نہیں لگ رہا ہے لیکن ہمارے پاس اب نہ تو کھانے کو خوراک ہے اور نہ ہی پینے کو پانی۔

گل بی بی کی کہانی بھی کچھ ایسی ہی ہے، وہ اشیائے ضروریہ کے لیے لیے گئے قرضے کو اتارنے کے لیے اپنی 9 سالہ بیٹی کو 23 سال کے نوجوان کے ساتھ بیاہنے پر مجبور ہوئی جس کے خاندان نے گل بی بی کو قرضہ دیا تھا۔

قلعہ نو کے کیمپ میں ہی محمد حسان نے روتے ہوئے اپنی 9 اور 6 سالہ بیٹیوں کی تصاویر دکھائیں جو اب کسی دور دراز علاقے میں پیسوں کے عوض بیاہی جا چکی ہیں اور اس کے بعد سے والدین سے مل بھی نہیں سکی ہیں۔

حسان کو اب ایک نئی مشکل درپیش ہے، اس کی بیمار بیوی دادگل کی ادویہ کے باعث قرضہ چڑھ گیا ہے جسے اتارنے کے لیے اب انھیں اپنی 4 سالہ تیسری بیٹی کی بھی قرض اتارنے کے عوض دکاندار کے بیٹے سے شادی کرنا ہو گی۔

حسان کی بیمار بیوی دادگل کہتی ہیں میں کسی دن پاگل ہو جاؤں گی اور کیمپ سے بھاگ نکلوں گی اور نہیں معلوم کہاں جاؤں گی۔ ایک اور 43 سالہ بیوہ خاتون رابعہ کے حالات قدرے مختلف ہیں انھوں نے جیسے تیسے کر کے اپنی بیٹی کو 12 سال سے اپنے پاس ہی رکھا ہوا ہے، وہ 550 ڈالر جمع کر رہی ہیں۔ رابعہ کا 11 سالہ بیٹا ایک بیکری میں کام کرتا ہے اور 9 سالہ بیٹا کچرا چنتا ہے تاکہ بہن کے سسرال والوں کو قرضہ چکا دیں اور بے جوڑ شادی سے جان چھوٹ جائے۔ لیکن اب رابعہ کی بیٹی کے سسرال والے رخصتی کے لیے بضد ہیں اور رابعہ مزید ایک سال کی مہلت کی بھیک مانگ رہی ہے۔

ملک کے تیسرے بڑے شہر ہرات کے نواحی علاقوں میں بھی حالات بہتر نہیں، بے زمین ہو جانے پر علاؤالدین نامی کسان اپنی 10 سالہ بیٹی کو فروخت کرنے پر مجبور ہوا اور ایسا ہی چلتا رہا تو شاید 5 سالہ بیٹی کو بھی بیچنا پڑے۔ یہ کہتے ہوئے اس کے ہاتھ لرز رہے تھے، آواز بھرائی ہوئی تھی اور آنکھیں اس کی زمین کی طرح بنجر تھیں۔ قلعی نو کے کیمپ کے سربراہ نے بتایا کہ کم عمری میں شادی افغانستان کی قدیم روایت ہے جو اب دم توڑنے لگی تھیں اسی طرح شادی کے عوض دلہا کے خاندان سے رقم لینے کی رسم بھی تقریباً ختم ہو گئی تھی لیکن بھوک اور افلاس نے دوبارہ ہمیں پرانی نہج پر لے آیا۔ اقوام متحدہ کے ورلڈ فوڈ پروگرام نے بھی خبردار کیا ہے کہ افغانستان کی آدھی سے زیادہ آبادی کو قحط کا سامنا ہے اور نومبر سے 2 کروڑ 28 لاکھ افراد کو غذائی قلت کا سامنا ہو گا صوبے بدغیث کے نگراں گورنر مولوی

عبدالستار نے اے ایف پی سے گفتگو میں بتایا کہ کم عمری میں شادی کی بنیادی وجہ غربت ہے یہ نہ تو امارت اسلامیہ افغانستان کا قانون ہے اور نہ ہی کوئی شرعی حکم۔

تائی کوانڈو کی 19 سالہ افغان مرضیہ حمیدی کے بڑے خواب تھے، وہ شوق سے قومی اور بین الاقوامی مقابلوں میں حصہ لینے کے خواب دیکھا کرتی تھیں لیکن اگست میں طالبان کی آمد کے بعد ان کی امیدیں اور توقعات دھندلانے لگی ہیں۔ ستمبر میں انھیں چھپنا بھی پڑا جب انھیں یہ پتہ چلا کہ ان کے گروپ کے کچھ لوگ ان کی تلاش میں آئے تھے۔

مرضیہ حمیدی نے غیرملکی خبررساں ادارے (الجزیرہ) سے بات کرتے ہوئے بتایا کہ جب طالبان برسراقتدار آئے تو انھوں نے اپنے سارے تمغے تباہ کرنے یا جلانے کے بارے میں بھی سوچا تھا، مرضیہ کے انسٹاگرام پر 20 ہزار سے زائد فالوورز ہیں لیکن ان دنوں وہ تاریک ہے، اب انھوں نے نئے افغان حکمرانوں کے ڈر سے سیاہ عبایا اور اسی رنگ سے ملتا جلتا حجاب پہننا شروع کر دیا ہے، خوف کی اس صورت حال کا سامنا کرنے والی مرضیہ اکیلی نہیں ہیں بلکہ بہت سی افغان خواتین جبری طور پر منظر عام سے ہٹ جانے کے اندیشوں میں مبتلا ہیں جس سے وہ طالبان کے زیر قبضہ افغانستان کے پہلے پانچ سالہ دور میں گزر چکی ہیں۔ ایک اور خاتون بینا نعیمی جو ایک غیر ملک کمپنی کے لیے کام کرتی ہیں، طالبان کی آمد کے بعد افغانستان چھوڑ سکتی تھیں لیکن وہ پشتو ادب میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے باعث ملک سے باہر نہیں گئیں تاہم وہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد بیرون ملک مواقع تلاش کرنا چاہتی ہیں۔ طالبان نے حکومت میں آنے کے بعد خواتین کے حقوق کا خیال رکھنے اور انھیں شریعت کے مطابق عام زندگی گزارنے کی اجازت دینے کا وعدہ کیا تھا لیکن ابھی تک ثانوی گرلز اسکولز بند ہیں اور صحت کے شعبے کے علاوہ متعدد خواتین کو کام پر واپس لوٹنے میں مشکلات کا سامنا ہے۔ گذشتہ ماہ کئی شہروں میں خواتین کی جانب سے اپنے حقوق کے لیے مظاہرے بھی کیے گئے تھے جنھیں طاقت کے زور پر دبا دیا گیا تھا۔

(بشکریہ ایکسپریس میڈیا گروپ)

❁❁❁

سعودی عرب کی اولین گراں پری اور جسٹن بیبر کی پرفارمنس

کچھ برس قبل کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سعودی عرب میں اس طرح ناچ گانا ہو گا اور سعودی نوجوان مغربی میوزک پر تھرتھراتے نظر آئیں گے۔ تب اس ملک میں صرف ایسے کنسرٹس پر ہی پابندی نہیں تھی بلکہ اور بھی قدغنیں تھیں۔

معروف کینیڈین پوپ سٹار جسٹن بیبر نے اپنی گلوکاری سے سعودی شہر جدہ میں نوجوان سعودی نسل کو ناچنے پر مجبور کر دیا۔ اتوار کی رات منعقد ہوئے۔ اس کنسرٹ سے قبل انسانی حقوق کی تنظیموں اور کارکنان نے بیبر سے اپیل کی تھی کہ وہ سعودی عرب میں انسانی حقوق کی مخدوش صورتحال پر اپنا احتجاج ریکارڈ کراتے ہوئے اس کنسرٹ کو منسوخ کر دیں۔

تاہم بیبر نے جدہ میں پرفارم کر کے ایسی اپیلوں کو نظرانداز کر دیا۔ بیبر کی اہلیہ اور معروف ماڈل ہیلی بالڈون بیبر نے اپنے انسٹاگرام اکاؤنٹ پر اس کنسرٹ کی کامیابی کے لیے ایک حوصلہ بخش پوسٹ بھی کی۔ سوشل میڈیا پر کئی ایسی پوسٹیں شائع کی گئیں، جن میں جسٹن بیبر سرخ رنگ کے لباس میں پرفارم کر رہے ہیں۔ پوپ اور آر اینڈ بی سنگر جیسن ڈیریلو نے بیبر سے پہلے سعودی نوجوانوں کو مسحور کیا۔ ان کے علاوہ بھی کئی دیگر مغربی ستارے جدہ میں موجود تھے۔ بیبر جب پرفارم کر رہے تھے تو ان کے ساتھ خواتین ڈانسرز سویٹ پینٹس اور بیگی ٹاپس میں ناچ رہی تھیں۔ کچھ برس قبل کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سعودی عرب میں اس طرح کھلے عام ناچ گانا ہو گا اور سعودی نوجوان مغربی میوزک کی تانوں پر تھرتھراتے نظر آئیں گے۔ تب اس ملک میں کنسرٹس پر پابندی تھی جبکہ عوامی مقامات پر نامحرم مردوں اور خواتین کا اکٹھا ہونا بھی ناممکن تھا۔ تاہم کراؤن پرنس محمد بن سلمان نے سعودی عرب جیسے ایک قدامت پسند ملک میں اصلاحات لانے کا عمل شروع کیا، جس کا مقصد ملک کو غیر ملکی سرمایہ کاروں کے لیے دلکش بنانا اور نوجوان نسل کے لیے روزگار کے مواقع پیدا کرنا ہے۔ ہیومن رائٹس واچ اور انسانی حقوق کی دیگر تنظیمیں اور کارکنان البتہ اس نئے سعودی وژن کو ایک التباس قرار دیتے ہیں۔ انہوں نے جیسٹن بیبر سے بھی اپیل کی تھی کہ وہ اس کنسرٹ کا بائیکاٹ کر دیں کیونکہ اس طرح کے ایونٹس کا انعقاد دراصل سعودی عرب میں انسانی حقوق کی ابتر صورتحال سے توجہ ہٹانے کی کوشش ہے۔

اتوار کو سعودی عرب میں اولین گراں پری کا اہتمام بھی کیا گیا تھا، جس کی خوشی میں رات کو اس کنسرٹ کا میلہ سجا۔ جدہ میں ہوئی فارمولا ون ریس میں برطانوی ڈرائیور لوئیس ہیملٹن پہلی پوزیشن حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اس ریس کو دیکھنے کی خاطر محمد بن سلمان بھی جدہ کے سرکٹ میں موجود تھے، جہاں انہوں نے سعودی نوجوانوں کے ساتھ سیلفیاں بھی بنوائیں۔ سعودی عرب میں ان ایونٹس کے بائیکاٹ کی اپیل کرنے والوں میں مقتول سعودی صحافی جمال خاشقجی کی منگیتر بھی شامل تھیں، جنہوں نے واشنگٹن پوسٹ میں شائع ہونے والے اپنے ایک کھلے خط میں بالخصوص بیبر سے درخواست کی کہ وہ اس کنسرٹ کو منسوخ کر دیں۔ خدیجہ چنگیز نے بیبر سے مخاطب ہوئے لکھا، ''ایک طاقتور پیغام دیتے ہوئے یہ پرفارمنس منسوخ کر دینا چاہیے کہ آپ کے نام اور ٹیلنٹ کو استعمال کرتے ہوئے ایسے ملک کی ساکھ کو بہتر نہیں بنایا جائے گا جو اپنے سیاسی منحرفین کو قتل کروا دیتی ہے۔''

تاہم کئی دیگر اسٹارز کی طرح بیبر نے بھی اس دباؤ کو نظرانداز کر دیا۔ کئی دیگر مغربی اسٹارز کی طرح سن 2019 میں مرایا کیری نے بھی سعودی عرب میں پرفارم کیا تھا۔

❁❁❁

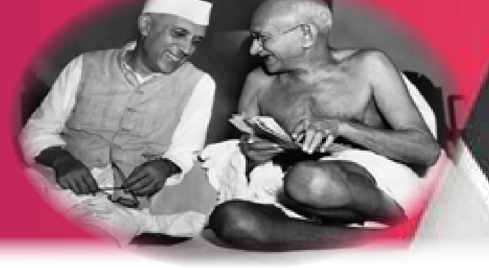

نہرو کی اہمیت

تحریر: شنکر رے/ترجمہ: خالد محمود

ہندوستان کے پہلے وزیرِ اعظم، دلی طور پر آزادی پسند اور ایک ضروری جمہوری فضیلت تھے۔ جواہر لعل کی روح دائیں بازو کے ہندو قوم پرستوں کو اُن کے مسلسل ڈراؤنے خوابوں میں اعصابی شکستگی سے دوچار کئے رکھتی ہے۔ اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں کہ ”سنگھ پریوار“ اپنے طوفانی دستوں کو جن میں ”اکھل بھارتیہ ودیارتھی پریشد“ جیسی انتہا پسند تنظیم شامل ہے، کو ہر ایسی جگہ حملہ کرنے پر اکساتی رہتی ہے جو نہرو کے نام سے منسوب ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ”زعفرانی نگہبان“ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں حرکت میں آچکے تھے۔ ان مضبوط مسلح کارکنوں کو اس وقت زیادہ تقویت ملی جب راجھستان میں بھارتیہ جنتا پارٹی کی حکومت نے سکولوں کی نصابی کتب سے نہرو کا نام حذف کر دیا تھا۔ لیکن زعفرانی نظریے کے پرچار کرنے والوں کی طرف سے یہ انتقامی موقف فطری ہے کیونکہ نہرو نے اپنی سوانح عمری Towards Freedom جو انہوں نے 1936 میں احمد آباد جیل میں لکھی تھی، میں واضح طور پر ”منظم مذہب“ پر تنقید کی تھی۔ وہ لکھتے ہیں، ”وہ تماشا جسے مذہب کہتے ہیں کسی بھی قیمت پر بھلے وہ ہندوستان میں ہو یا کہیں اور، منظم مذہب نے مجھے وحشت زدہ کر چکا ہے۔ میں نے اکثر اس کی مذمت کی ہے اور اس سے جان چھڑانے کی خواہش کی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اندھا یقین اور ردِ عمل، عقیدہ اور تعصب، توہم پرستی اور استحصال، شخصی مفادات کے تحفظ کی خاطر ہمیشہ کھڑے ہوتے ہیں۔ تین سال پہلے انہوں نے گاندھی جی کو لکھا تھا کہ مذہب میرے لئے مانوس بنیاد نہیں ہے۔ جیسے جیسے میں بڑا ہوتا گیا میں مذہب سے دور ہوتا چلا گیا ہوں۔ میرے پاس اس کا متبادل کچھ اور ہے جو ذہانت اور عقل سے قدیم ہے اور ہمیشہ مجھے طاقت اور امید بخشتی ہے۔ اس کے باوجود وہ مذہبی رسومات سے اُس وقت تک رواداری برتتے تھے جب تک اس کے پیچھے سیاسی محرکات نہ آجائیں۔ لیکن سنگھ پریوار کے نظریہ سازوں نے ایک خاص وجہ سے نہرو کو اپنا دشمن قرار دیا ہے۔ انہوں نے بارہا کہا کہ فاشزم کی ہندوستانی شکل صرف اکثریت کی فرقہ واریت کی وجہ سے آسکتی ہے۔ انہوں نے اپنے اس عقیدے کو کبھی نہیں چھپایا کہ اقلیت کی فرقہ واریت اگرچہ قابل نفرت ہے مگر یہ فاشزم لانے کا امکان نہیں رکھتی ہے۔ یہ تفہیم برصغیر میں فاشزم کو ایک امکان کے طور سمجھنے کے لئے اولین مقدمات میں سے ایک تھی۔ انہوں نے خود کو سرکاری مارکسسٹوں کی اُس تنگ نظر کتابی وضاحت تک محدود نہیں رکھا جو کمیونسٹ انٹرنیشنل کے جنرل سیکرٹری جارجی دیمیتروف کی کہی بات کو دہراتے رہتے تھے کہ ”فاشزم مالیاتی سرمائے کی دہشت گرد آمریت ہے“ جو یورپ کی حد تک تو درست تھی مگر برصغیر کے لئے نہیں۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ نہرو نے فاشزم کو ہندوستان میں ایک مخفی رجحان کی صورت سمجھا تھا جب کہ یورپ وہی تھا جسے رابندر ناتھ ٹیگور نے اپنے گیت ”دنیا نفرت کے ہذیان کے ساتھ وسیع ہے“ میں لکھا تھا۔ نہرو کے سوانح نگار ساروپلی گوپال نے اپنے انصاری میموریل لیکچر (1988) میں کہا ہے کہ مسلمان فرقہ پرست کم از کم اپنے مذہبی نقطہ نظر میں متوسط طبقے کے نمائندہ تھے۔ جب کہ ان کے راہنما ہندو مہاسبھا کے اُن لیڈرز کی نسبت زیادہ وقار کے ساتھ برتاؤ کرتے تھے جو صرف سرمایہ داروں، جاگیر داروں، چند والیان ریاست اور ان کے خوشامدیوں کی نمائندگی کرتے تھے۔ نہرو نے اپنا یہ نظریہ برقرار رکھا کہ فرقہ ورانہ جماعتیں سیاسی رد، عمل نے کھڑی کی ہیں۔ لیکن آخر میں وہ اس نتیجے پر پہنچ گئے تھے کہ یہ فرقہ واریت کسی حد تک ہندوؤں میں موجود ہے جو کسی وقت قوم پرستی کا روپ دھار سکتی ہے۔ یہ ہندوستانی فاشزم کا نسخہ تھا جو سخت ترین مذمت کے لائق ہے۔ نہرو انڈین نیشنل کانگریس کے دیگر راہنماؤں کی نسبت، کئی حوالوں سے مختلف تھا۔ وہ واحد راہنما تھا جس نے اپنی خود نوشت میں جدید ریاست کے تصور کی مخالفت کی تھی۔ تشدد جدید ریاست اور سماجی نظام زندگی کا دورانِ خون ہے۔ انہوں نے مزید کہا، کہ ریاست کی بنیادی نوعیت طاقت، جبر اور حکمران گروپ کا تشدد ہے۔ یہاں نہرو (اور ٹیگور بھی) مارکس کے ساتھ کھڑے تھے جب کہ سرکاری مارکسسٹ، بلکہ بشمول لینن، سٹالن کا تو ذکر ہی کیا حتیٰ کہ ٹراٹسکی بھی مارکس اور اینگلز کی بات سے منحرف ہو چکے تھے۔ پاریش چٹوپادھیائے، جو بلاشبہ دُنیا بھر کے بہترین مارکسی دانشوروں میں سے ایک ہیں، نے حال ہی میں اکنامک اور پولیٹیکل ویکلی میں شائع ہونے والے ایک مقالے میں لکھا ہے کہ بیسویں صدی کا سوشلزم اقلیتی حکمرانی کی دہشت گردی پر مرکوز تھا۔ کرانسٹاڈٹ کو چھوڑ دیں جو 1905 کے انقلاب کے ہیرو تھے۔ مئی 1918 میں جب لینن اور ٹراٹسکی بالشویک طاقت کے سربراہ تھے ایک لاکھ چھیالیس ہزار کارکنوں نے پیٹروگراڈ میں خوراک اور نوکریوں کے مطالبے کے لئے ریلی نکالی تھی۔ حکومت نے سرعت سے ردعمل دیا۔ ہڑتال کے لئے ہمدردی کی کسی بھی علامت کو مجرمانہ فعل قرار دیا۔ یکم جولائی کو ماسکو اور پیٹروگراڈ کے مرکزی مقامات پر مشین گنیں نصب کر دی گئی تھیں۔ پاریش چٹوپادھیائے لکھتے ہیں کہ جلسوں کو زبردستی منتشر کیا گیا اور ہڑتال کو روک دیا گیا تھا۔ چٹوپادھیائے نے لکھا کہ روسی سوشلسٹ ڈیموکریٹک لیبر پارٹی (بالشویک) کی نویں کانگریس میں لینن جو کہ بالشیک انقلاب کے مصنف تھے نے بدنام جمہوریت کے خلاف ڈنڈا اٹھایا تھا۔ یہ سب مارکس کی تعلیم سے بنیادی انحراف تھا جس نے شخصی آزادی اور آزادی پسند اصولوں کا غیر متزلزل دفاع کیا تھا۔ تاہم، سرپرست کو بھی اپنی سوشلسٹ حامی وابستگی سے، خاص طور پر وزارتِ عظمیٰ کے ابتدائی سالوں میں پھسلنا پڑا تھا۔ 1948 میں نہرو نے فیڈریشن آف انڈین چیمبرز آف کامرس اینڈ انڈسٹری کے راہنماؤں کو یقین دلایا کہ اس کی حکومت بڑی صنعتوں کو قومیانے کی خواہش مند نہیں ہے۔ ہمیں سوچنا اور غور کرنا ہے کہ کس چیز کو نیشنلائز کریں اور کس کو نہ کریں (کمل ارن متراچنائے، دی رائز آف بگ بزنس ان انڈیا صفحہ 126)۔ اپنی خودنوشت میں اُن کا اپنے متعلق تحقیر آمیز بیان یاد آتا ہے کہ میری سیاست میرے اپنے طبقے بورژوا کی تھی۔ تاہم اُس کی موت کے 42 سال بعد بھی، نہرو کی اہمیت بالخصوص آزادی پسندوں کے لئے، جو کانگریس اور لیفٹ میں موجود ہیں، کم نہیں ہوئی۔ اپنی ڈائیری میں 17 اپریل 1935 کو لکھا کہ ہم کتنے مکروہ لوگ ہیں؟ سیاست، ترقی، سوشلزم، کمیونزم، سائنس وہ اس سیاہ مذہبی وحشت کے سامنے کہاں ہیں؟ ❁❁❁❁

کوانٹم کمپیوٹنگ

شعبہ انٹرنیشنل

امریکہ، چین اور انڈیا سمیت دیگر ممالک کوانٹم کمپیوٹرز بنانے کی دوڑ میں کیوں؟

آنے والے وقتوں میں کوانٹم کمپیوٹنگ مؤثر طریقے سے دنیا اور ہماری زندگیوں کو بدل سکتی ہے۔ اس ٹیکنالوجی کی اہمیت کا احساس کرتے ہوئے انڈیا کی حکومت نے گذشتہ سال ٹیکنالوجی کی ترقی کے لیے بجٹ میں آٹھ ہزار کروڑ روپے مختص کیے تھے۔ اس کے بعد رواں سال اگست کے آخری ہفتے میں حکومت نے کوانٹم سیمولیٹر ٹول کِٹ 'کیو سِم' لانچ کی جس کے ذریعے سائنسدانوں اور کاروباری افراد کے لیے اس شعبے میں تحقیق کرنا آسان بنا دیا گیا۔ مستقبل کو نئی سمت دینے کے لیے انڈیا کے علاوہ دیگر ممالک بھی اس ٹیکنالوجی میں سرمایہ کاری کر رہے ہیں۔ امریکی حکومت نے سنہ 2018 میں نیشنل کوانٹم انیشیٹو ایکٹ نافذ کیا اور اس کے لیے 1.2 بلین ڈالر کا انتظام کیا۔ چین کی کمیونسٹ حکومت میں کوانٹم کمیونیکیشنز سنہ 2016 یعنی 13ویں پانچ سالہ منصوبے کے تحت اہم صنعتوں میں حکمت عملی کے طور پر شامل ہیں۔ برطانیہ نے سنہ 2013 میں اس کے لیے ایک قومی حکمت عملی بنائی تھی اور کینیڈا نے سنہ 2016 میں اس ٹیکنالوجی میں 50 ملین کینیڈین ڈالر کی سرمایہ کاری کا اعلان کیا تھا۔ ان کے علاوہ جرمنی، فرانس، جنوبی کوریا، روس، جاپان اور گوگل، ایمیزون، مائیکروسافٹ جیسی کمپنیاں بھی اس ٹیکنالوجی میں سرمایہ کاری کر رہی ہیں۔ تو اس بار ہم اس بات کی تحقیق کر رہے ہیں کہ کوانٹم کمپیوٹرز کیا ہیں اور اسے بنانے کے لیے ملکوں کے درمیان مقابلہ کیوں ہے۔

کوانٹم کمپیوٹر: غیر یقینی کی سائنس

کوانٹم کمپیوٹنگ کو سمجھنے سے پہلے یہ سمجھ لیں کہ کوانٹم کیا ہے؟

اس کی بحث بیسویں صدی کے اوائل میں شروع ہوئی۔ یہ وہی دور تھا جب البرٹ آئنسٹائن نے دنیا کو تھیوری آف ریلیٹیوٹی یا نظریہ اضافت دیا تھا۔ اب تک طبیعیات (فزکس) کلاسیکی نظریے پر مبنی تھی، جس کا تعلق حقیقت میں ہونے والے واقعات کی وضاحت سے تھا۔ اس کے مطابق کائنات میں چیزوں کا وجود ان کی تبدیلی سب کچھ یقینی ہے۔ ڈاکٹر سوہنی گھوش ولفریڈ لاریئر یونیورسٹی، کینیڈا میں فزکس اور کمپیوٹر سائنس کی پروفیسر ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ ان معلومات کو ایک طرف رکھتے ہوئے آپ کو ایک مختلف نقطہ نظر رکھنا ہوگا کہ شاید کائنات میں ہر چیز اس طرح طے نہیں جیسا کہ ہم مانتے رہے ہیں۔ ہمیں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ طبیعیات کے اصولوں میں ایک بنیادی غیر یقینی صورتحال ہے۔ اور یہ غیر یقینی صورتحال مادے کے سب سے چھوٹے ذرے، ایٹم کے مالیکیول کے انداز میں مضمر ہے۔ کوانٹم میکانکس ان چھوٹے مالیکیولز کے رویے کا مطالعہ ہے، جسے طبیعیات کے کلاسیکی نظریہ کے دائرے میں سمجھنا ممکن ہے۔ سائنسدان نیلس بوہر نے اس غیر یقینی صورتحال کے بارے میں کہا کہ 'ہر وہ چیز جسے ہم حقیقی مانتے ہیں وہ چیزوں سے بنی ہے جسے حقیقی نہیں کہا جا سکتا۔' شاید یہی وجہ تھی کہ آئنسٹائن نے اس کے بارے میں کہا تھا کہ اگر یہ سچ ہوتا تو یہ سائنس کے طور پر فزکس کا خاتمہ ہوتا۔ ڈاکٹر سوہنی گھوش کہتی ہیں کہ 'میں اسے اس طرح سمجھنے کی کوشش کرتی ہوں کہ ایک سکّے کے دو رُخ ہوتے ہیں، ہیڈ اور ٹیل یعنی سر اور دم۔ اگر سکّے کو گھمایا جائے تو سر یا دم آئے گا، اس کا امکان 50،50 فیصد کے برابر ہے۔' ان کا کہنا ہے کہ طبیعیات کے مطابق جب کوئی سکّہ پھینکا جاتا ہے تو یہ یا تو سر یا دم ہوتا ہے۔ لیکن اگر ہم اسے کوانٹم سکّے کے طور پر دیکھیں تو وقت کے کسی ایک مقام پر صرف سر یا دم ہی نہیں ہوتا ہے۔ ایک سکہ اچھالا جاتا ہے، لیکن اس کی شناخت غیر یقینی ہے۔ آپ کوانٹم سکّے کو دو اطراف تک محدود نہیں کر سکتے۔ اس میں عام سکّوں کی نسبت بہت زیادہ غیر یقینی صورتحال ہے، یعنی وہ غیر بائنری ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ 'ہم اس کو سپر پوزیشن کہتے ہیں یعنی جب سکّہ گھومتا ہے تو ایک وقت میں دونوں اطراف ایک ساتھ ہوتے ہیں یعنی ایک وقت میں ایک سے زیادہ امکانات ہوتے ہیں۔ یہ ہمارے اب تک کے تجربے سے اتنا مختلف ہے کہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ آسان نہیں ہے۔' اس اصول پر کام کرنے والے سائنسدانوں کا خیال ہے کہ یہ غیر یقینی صورتحال یعنی غیر بائنری ہونا کسی چیز کی فطرت ہے۔ ڈاکٹر سوہنی گھوش کہتی ہیں کہ 'کوانٹم کمپیوٹرز کا تصور ہی انھیں انقلابی بناتا ہے۔' وہ کہتی ہیں کہ یہ ٹیکنالوجی فزکس کے بالکل مختلف اصولوں پر کام کرتی ہے۔ یہ ایسی چیز ہے کہ گاڑی آپ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کا کام کرے گی، لیکن یہ سائنس کے مختلف اصولوں پر مبنی ہوگی۔ غیر یقینی صورتحال کوانٹم دنیا میں ہر چیز کی نوعیت ہے، اور یہ ان لوگوں کے لیے سمجھنا ضروری ہے جو ایسی مشینیں بنانا چاہتے ہیں۔

کوانٹم کمپیوٹر کیوں خاص؟

پروفیسر سٹیفنی ویہنر ڈیلفٹ یونیورسٹی آف ٹیکنالوجی میں سینٹر فار کوانٹم کمپیوٹنگ چلاتی ہیں۔ وہ بتاتی ہیں کہ کس طرح کوانٹم کمپیوٹر عام کمپیوٹر سے بہتر ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ 'ایک عام کمپیوٹر معلومات کو صفر اور ایک میں پروسیس کرتا ہے۔ اگر آپ مجھے ایک ویڈیو بھیجتے ہیں، تو کمپیوٹر اسے زیرو اور ون سیریز کے لاکھوں ٹکڑوں میں تقسیم کر کے مجھے بھیجتا ہے، اور پھر میں اسے دوبارہ بناتی ہوں۔ آپ کی بھیجی ہوئی ویڈیوز دیکھیں۔ لیکن ایک کوانٹم کمپیوٹر پر ہم کوانٹم بٹس میں کام کرتے ہیں۔ اس میں صفر اور ایک کے علاوہ دونوں ایک ساتھ ہو سکتے ہیں۔' یہ اس سپر پوزیشن کی وجہ سے ہے جس کے بارے میں ہم نے کچھ دیر پہلے بات کی تھی۔ یہ جاننے کے لیے کہ یہ کیسے ہوتا ہے، تصور کریں کہ آپ ایک بھول بھلیاں میں ہیں اور باہر نکلنے کے لیے کمپیوٹر کی مدد لیں۔ پروفیسر سٹیفنی ویہنر کہتی ہیں کہ اگر آپ بائیں طرف جانا چاہتے ہیں، تو آپ کمپیوٹر سے پوچھتے ہیں کہ آپ کے بائیں طرف راستہ تلاش کرنے کا کتنا امکان ہے۔ ایک کوانٹم بِٹ صفر اور ایک ہو سکتا ہے یا بائیں اور دائیں کو ایک ساتھ کہہ لیں، آپ دونوں کو تلاش کر سکتے ہیں یعنی ایک وقت میں دونوں امکانات کی تلاش ہو سکتی ہے۔ یہ اتنا آسان نہیں ہے، لیکن یہ آپ کو بتاتا ہے کہ ایک کوانٹم کمپیوٹر میں عام کمپیوٹر کے مقابلے میں کچھ سوالات ہوتے ہیں۔ جوابات تیزی سے مل سکتے ہیں کیونکہ ایک کوانٹم کمپیوٹر ایک ہی وقت میں متعدد امکانات پر کام کر سکتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوسکتا ہے کہ ایسا سپر فاسٹ کمپیوٹر طب کے شعبے میں کیا کردار ادا کر سکتا ہے۔ کیا یہ نئی دوائیں بنانے میں مدد کر سکتے ہیں؟ وہ کہتی ہیں کہ آپ تجربہ گاہ میں جا کر یہ جانچ سکتے ہیں کہ آیا کوئی کیمیکل دوا بنانے میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ چونکہ اس میں وقت لگ سکتا ہے، اس لیے لوگ نئی چیزوں کے بارے میں تحقیق کرنے کے بجائے نقلی طریقے سے سیکھنا چاہتے ہیں کہ کیا اس کا صحیح استعمال ہو گا یا نہیں۔

کیا ایک عام کمپیوٹر ایسا کر سکتا ہے؟

پروفیسر سٹیفنی ویز کہتی ہیں کہ نظریاتی طور پر ایک عام کمپیوٹر وہ سب کچھ کر سکتا ہے جو ایک کوانٹم کمپیوٹر کر سکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس میں وقت کتنا لگے گا۔ کوانٹم کمپیوٹر میں یہ کام چند گھنٹوں میں ہو جائے گا، جب کہ ایک عام کمپیوٹر میں یہ کام کرنے میں زیادہ وقت لگے گا۔ اس کا مطلب ہے کہ کوانٹم کمپیوٹر ادویات کی تحقیق میں ایک نیا انقلاب لا سکتے ہیں۔ ایسے میں ان کی مانگ بڑھنی چاہیے، لیکن ایسا نہیں ہے۔

سخت چیلنج

پروفیسر ونفریڈ ہنسنگر سسیکس سینٹر فار کوانٹم ٹیکنالوجیز کے ڈائریکٹر ہیں۔ وہ کوانٹم کمپیوٹرز کی ٹیکنالوجی کو حقیقت بنانا چاہتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کوانٹم کمپیوٹر ایک طرح سے سائنس کا سب سے اہم اور گہرا راز ہے۔ ان میں حیرت انگیز امکانات ہیں اور وہ بہت سے کام کر سکتے ہیں۔ لیکن ان کی تعمیر کرنا انتہائی مشکل چیلنج ہے کیونکہ اس کے لیے آپ کو سپر پوزیشن جیسے عمل کو کنٹرول کرنے کی ضرورت ہے۔ جو تقریباً ناممکن ہے۔ اور ایسا کیے بغیر آپ حساب نہیں کر پائیں گے۔ پچھلی تین دہائیوں سے سائنسدان ایسا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن زیادہ تر اس میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ پروفیسر ہنسنگر بتاتے ہیں کہ دو پلیٹ فارمز کے نتائج مثبت تھے۔ ان میں سے ایک سپر کنڈکٹنگ سرکٹ ہے جسے مائیکروسافٹ، آئی بی ایم اور گوگل کوانٹم کمپیوٹر بنانے کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ یہ ایک خاص قسم کا الیکٹرانک سرکٹ ہے جسے استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔ اسے دو سو پچاس ڈگری سیلسیئس سے کم درجہ حرارت پر ٹھنڈا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ غلطی کے مارجن کے بغیر 'کیوبٹ' بنانے کی صلاحیت کا انحصار اس بات پر ہے کہ مائیکرو چپ فریج کو کتنی بڑی مقدار میں ٹھنڈا کرنے کے قابل ہے۔ اور سپر کنڈکٹنگ سرکٹس کا مسئلہ یہ ہے کہ بڑا فریج بنانا آسان نہیں ہے۔ پروفیسر ہنسنگر اور ان کی ٹیم اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ وہ مائیکروسکوپک پارٹیکل آئنز کو پھنسانے کا راستہ اختیار کر رہے ہیں۔ آئن ایسے مالیکیول ہیں جن کا برقی چارج کم ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر آئنز کو الگ کر دیا جائے تو انھیں عام درجہ حرارت پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس تکنیک میں آپ ایک مائیکرو چپ استعمال کرتے ہیں جو ایک الیکٹرک فیلڈ بناتی ہے۔ اس کی وجہ سے چارج شدہ آئن مائیکرو چپ کے اوپر تیرتے ہیں۔ ہر ایک آئن ایک مائیکرو چپ کے طور پر کام کرتا ہے۔ کوانٹم بٹ، جس میں صفر اور ایک کی معلومات کو محفوظ کیا جا سکتا ہے۔ ایسے بہت سے آئن بنائے جاتے ہیں اور ان کے ذریعے کوانٹم کمپیوٹنگ کی جا سکتی ہے۔ واضح رہے کہ یہ ٹیکنالوجی جلد عام استعمال کے لیے دستیاب نہیں ہونے والی ہے۔ لیکن جن مشینوں پر یہ کام کیا جاتا ہے وہ کیسی نظر آتی ہیں؟ پروفیسر ہنسنگر کا کہنا ہے کہ وہ کمپیوٹر بہت بڑے ہیں، آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ دنیا کے پہلے کمپیوٹرز سے صرف چند میٹر چھوٹے ہیں جو ویکیوم ٹیوب سسٹم پر مبنی تھے۔ ان میں لیزر، الیکٹرانکس اور آپٹیکل سسٹمز ہیں۔ یہ سائنس فکشن ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے مستقبل کی مشینیں فلم میں دکھائی گئی ہیں۔ پروفیسر ہنسنگر اور ان کی ٹیم اب تک کوانٹم کمپیوٹر کے پانچ پروٹو ٹائپ بنا چکی ہے۔ لیکن دوا بنانے جیسے کام کے لیے انھیں بڑی تعداد میں ہاتھ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے میں وہ بڑے پیمانے پر کیوبٹس بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ کوانٹم کمپیوٹرز کے استعمال میں یہ سب سے بڑا چیلنج ہے۔ دنیا بھر میں اس وقت جو کوانٹم کمپیوٹر بنائے جا رہے ہیں وہ بہت کم کیوبٹس بنانے کے قابل ہیں۔ ہم دس بیس کیوبٹس بنانے کی بجائے ہزاروں بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پروفیسر ہنسنگر کا کہنا ہے کہ یہ 1940 کی دہائی کی بات ہے جب چھوٹے چھوٹے کام کرنے کے لیے بڑی مشینیں ہوا کرتی تھیں، جو مہنگی ہوتی تھیں اور جن کو چلانا مشکل ہوتا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ تکنیک عام ہونے لگی۔ انھیں امید ہے کہ چند برسوں کے بعد کلاؤڈ کے ذریعے کوانٹم کمپیوٹر استعمال کر سکیں۔

کوانٹم کمپیوٹنگ کی دوڑ جو خلائی دوڑ کی طرح ہے

جوناتھن ڈاؤلنگ امریکہ کی لوزیانا یونیورسٹی میں پروفیسر تھے۔ انھوں نے کوانٹم کمپیوٹر کی صلاحیت پر طویل عرصے تک کام کیا۔ جون سنہ 2020 میں اپنی موت سے قبل بی بی سی کے ساتھ بات چیت میں، انھوں نے کہا تھا کہ مختلف ممالک کے درمیان کوانٹم کمپیوٹر بنانے کا مقابلہ ہے اور یہ ایک خلائی دوڑ کی طرح ہے۔ یہ ڈیٹا کو محفوظ رکھنے، ذاتی ڈیٹا، کمپنیوں، فوج اور حکومتوں کے ڈیٹا کو محفوظ رکھنے کی دوڑ ہے۔ ڈیٹا طاقت ہے اور اب ممالک یہ محسوس کر رہے ہیں کہ اس معاملے میں انھیں خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ سنہ 2013 میں امریکی انٹیلی جنس کنٹریکٹر ایڈورڈ سنوڈن نے حکومت سے متعلق کئی انٹیلی جنس دستاویزات کو لیک کیا۔ ان دستاویزات سے پتا چلا کہ امریکی نیشنل سکیورٹی ایجنسی دوسروں کے مواصلاتی نیٹ ورک کو کس حد تک توڑ سکتی ہے۔ جوناتھن نے کہا کہ ایڈورڈ سنوڈن کی لیکس نے چین کو حیران کر دیا کہ امریکی نیشنل سکیورٹی ایجنسی کمیونیکیشن نیٹ ورک کی خلاف ورزی کرنے میں ان کی سوچ سے بہت آگے ہے۔ انھیں یہ بھی خدشہ تھا کہ امریکی پہلا کوانٹم کمپیوٹر بنائیں گے۔ ایسا ہوا تو امریکہ چین کی انٹیلیجنس بڑھ جائے گا لیکن چین کو اس کے راز پڑھنے سے روک سکے گا۔ وہ کیسے؟ وہ بتاتے ہیں کہ 'فرض کریں کہ باب اپنی دوست ایلس کو ایک خفیہ پیغام بھیجنا چاہتا ہے اور ایو وان کے کمیونیکیشن چینل کو توڑنا چاہتی ہے۔ اس وقت محفوظ پیغامات بھیجنے کے لیے پبلک کی انکرپشن کی تکنیک استعمال کی جاتی ہے۔ باب پیغام کو لاک کر دیتا ہے۔' اس کا لاک صرف ایلس کے پاس ہے اور وہ اسے کھول سکتی ہے۔ 'پبلک کی' سکیورٹی کا تصور یہ ہے کہ ایک عام کمپیوٹر کو ہیک کرنے میں سینکڑوں سال لگتے ہیں۔ لیکن کوانٹم کمپیوٹر اسے چند گھنٹوں میں ہیک کر سکتا ہے۔ یہ سننے میں خوفناک لگتا ہے۔ لیکن اس کا ایک مثبت پہلو بھی ہے یعنی اگر آپ 'کوانٹم کی' استعمال کریں گے تو کوانٹم کمپیوٹر بھی اسے ہیک نہیں کر سکے گا اور یہ سپر پوزیشننگ کی وجہ سے ممکن ہو گا۔ اگر 'کوانٹم کی' کو ہیک کرنے کی کوشش کی گئی تو اس میں درج معلومات خود بخود ختم ہو جائے گی اور بھیجنے والے کو اس کا علم ہو جائے گا۔ کوانٹم کمپیوٹرز کے ذریعے کمیونیکیشن مکمل طور پر محفوظ رہے گی۔ اسے بنانے کی دوڑ کے پیچھے یہی وجہ ہے۔ جوناتھن ڈولنگ کے مطابق چین اس ٹیکنالوجی میں بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کر رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ 'چین ایک نیٹ ورک بنا رہا ہے جس میں سیٹلائٹ کو بھی شامل کیا جائے گا۔ کوانٹم کرپٹوگرافی کا نیٹ ورک پورے ملک میں فائبر یا سیٹلائٹ کے ذریعے پھیلایا جائے گا اور یہ پورے نیٹ ورک کو ہیک پروف کر دے گا جو لوگ ترقی نہیں کر سکے انھیں مستقبل میں ڈیٹا ہیک کا خطرہ لاحق رہے گا۔ امریکہ اور دیگر ممالک بھی اس ٹیکنالوجی میں بہت زیادہ سرمایہ کاری کر رہے ہیں۔ لیکن سائنسدانوں کے سامنے چیلنج یہ ہے کہ وہ اس ٹیکنالوجی کو حقیقت میں بدلیں اور اس پر بڑے پیمانے پر کام کریں۔ لیکن کوانٹم دنیا کے سب سے اہم کھلاڑی ایٹم کے بے ترتیب رویے کی وجہ سے ان انتہائی طاقتور مشینوں کو بنانا ایک مشکل چیلنج ہے۔ بہت سے ممالک اس ٹیکنالوجی پر قابو پانے کی دوڑ میں ہیں۔ جوناتھن کا کہنا ہے کہ یہ دوڑ کہاں جا رہی ہے اس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا۔ لیکن یہ اپنے اندر ہیجان پیدا کرنے والی ہے۔ (بشکریہ بی بی سی)

طلاق کے لیے 55 کروڑ پاؤنڈ کا سمجھوتہ

دبئی کے حکمران شیخ محمد بن راشد المکتوم اور ان کی اہلیہ شہزادی حیا کے درمیان طلاق کے مقدمے کو برطانیہ کی قانونی تاریخ کا سب سے بڑا مقدمہ قرار دیا جا رہا ہے۔ اس مقدمے کے فیصلے کے تحت شیخ محمد اپنی اہلیہ اردن کے سابق شاہ حسین کی 47 سالہ بیٹی حیا بنت الحسین کو طلاق کے نتیجے میں 55 کروڑ پاؤنڈ دیں گے جس میں نقد رقم اور اثاثے شامل ہیں۔ برطانوی ہائی کورٹ نے منگل کو شیخ محمد کو حکم دیا ہے کہ وہ شہزادی حیا کو یکمشت ساڑھے پچیس کروڑ پاؤنڈ کی رقم ادا کریں۔ شیخ محمد المکتوم دبئی کے ارب پتی حکمران اور متحدہ عرب امارات کے وزیر اعظم ہیں اور شہزادی حیا ان کی چھ بیویوں میں سب سے چھوٹی بیوی تھیں۔ فیصلے میں شہزادی حیا کو کروڑوں پاؤنڈ کی دو جائیدادوں کے انتظامات کے اخراجات کے لیے بھی رقم فراہم کی گئی ہے۔ ان میں ایک جائیداد لندن کے کینزنگٹن پیلس میں واقع ہے جبکہ دوسری سرے کاؤنٹی کے ایک قصبے ایگھم میں ان کی مرکزی رہائش گاہ ہے۔ عدالت میں شہزادی کی سلامتی اور حفاظت کے لیے ایک خاطر خواہ رقم مختص کی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی چھٹیوں پر ہونے والے اخراجات، ان کے ملازمین کی تنخواہیں، ان کے گھر میں آیاؤں، نرسوں اور دیگر عملے کی تنخواہیں کے ساتھ ساتھ شہزادی کے گھر میں رہنے والے پالتوں جانوروں کے اخراجات بھی ادا کرنے کی ذمہ داری دبئی کے شیخ پر عائد کی گئی ہے۔ عدالت نے شیخ محمد کو اس جوڑے کے دو بچوں، 14 سالہ بیٹی اور نو سالہ بیٹے میں سے ہر ایک کو الگ الگ سالانہ 56 لاکھ پاؤنڈ بھی دینے کا حکم دیا ہے۔ اس رقم کی باقاعدہ ادائیگی کے لیے عدالت نے 29 کروڑ پاؤنڈ کی رقم بطور زرِ ضمانت رکھنے کا حکم بھی دیا ہے۔

موت کا خوف: طویل عرصے سے جاری اس قانونی جنگ نے مشرق وسطیٰ کے شاہی خاندانوں کی عام طور پر خفیہ دنیا کو افشا کیا ہے۔ شہزادی حیا سنہ 2019 میں اپنے بچوں کے ساتھ دبئی سے بھاگ کر برطانیہ آ گئی تھیں۔ انھوں نے فرار ہونے کا یہ جواز دیا تھا کہ انھیں خطرہ ہے کہ انھیں ہلاک کر دیا جائے گا، کیونکہ اس واقعہ سے قبل شیخ محمد نے ان کی دو دیگر بیٹیوں، شیخہ لطیفہ اور شیخہ شمسہ کو اغوا کر لیا تھا اور انھیں ان کی مرضی کے خلاف دبئی واپس بھیج دیا گیا تھا۔ 72 برس کے شیخ محمد نے، جو گھڑ دوڑ کی دنیا میں ایک بہت بااثر شخصیت مانے جاتے ہیں، اس اغوا کی تردید کی ہے۔ تاہم سنہ 2020 کے ہائی کورٹ کے فیصلے میں اغوا اور قتل کے تمام امکانات کو درست کہا گیا تھا۔ شیخ محمد المکتوم نے ایک نظم شائع کی تھی جس کا عنوان تھا 'تم زندہ رہے، تم مر گئے'۔ اس سے بڑے پیمانے پر یہ فرض کیا گیا تھا کہ شہزادی کو اس کے سابق برطانوی محافظ کے ساتھ تعلقات کا پتہ چلنے کے بعد قتل کر دیا جائے گا۔ شہزادی حیا کو برطانیہ منتقل ہونے کے بعد دھمکیاں ملتی رہیں۔ اُنھیں 'ہم کہیں بھی پہنچ سکتے ہیں' جیسے پیغامات ملتے رہے جس کے بعد انھوں نے اپنی جان کے خوف کی وجہ سے سکیورٹی پر بہت زیادہ رقم خرچ کی کہ کہیں ان کے بچوں کو اغوا نہ کر لیا جائے اور انھیں دبئی واپس نہ پہنچا دیا جائے۔ ہائی کورٹ نے اس سال فیصلہ دیا تھا کہ شیخ محمد نے شہزادی حیا، اس کے محافظوں اور اس کی قانونی ٹیم کے موبائل فون کو غیر قانونی طور پر ہیک کیا تھا، جس میں ٹوری پارٹی کی بیرونس شیکلٹن کا فون بھی شامل ہیں۔ یہ ہیکنگ پیگاسس نامی بدنامِ زمانہ سپائی ویئر کا استعمال کرتے ہوئے کی گئی تھی جو ہیکنگ کا نشانہ بنائے جانے والے فونز پر کنٹرول کرتا ہے اور اسے اسرائیلی فرم این ایس او (NSO) گروپ نے تیار کیا تھا۔ شیخ محمد نے کہا کہ ان کے قبضے میں ہیک کیا گیا کوئی مواد نہیں تھا اور اس کے ظاہری یا خفیہ اختیار سے کوئی نگرانی بھی نہیں کی گئی تھی۔ تاہم برطانیہ میں ہائی کورٹ کے فیملی ڈویژن کے صدر نے اپنے فیصلے میں اس سے مختلف رائے دی۔ طلاق کے فیصلے میں مسٹر جسٹس مور نے کہا کہ پہلے کے فیصلوں کو دیکھتے ہوئے شہزادی اور اس کے دو بچے خاص طور پر ایک خطرناک حالت میں پھنسے ہوئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ انھیں برطانیہ میں اپنی مسلسل حفاظت کو یقینی بنانے کے لیے بہت سخت سکیورٹی کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ انھیں جو بنیادی خطرہ درپیش تھا وہ بیرونی ذرائع سے نہیں تھا بلکہ ان بچوں کے والد کی طرف سے تھا، جو ریاست کے تمام وسائل استعمال کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جج نے کہا کہ 'ان بچوں کے لیے ایک واضح اور ہمیشہ سے موجود خطرہ ہے جو تقریباً یقینی ہے جب تک کہ وہ اپنی آزادی حاصل نہیں کر لیتے ہیں۔' جج نے شہزادی حیا کے بارے میں مزید کہا کہ 'ان کے لیے اپنی باقی زندگی میں ایک واضح خطرہ ہمیشہ موجود رہے گا، چاہے وہ (شیخ محمد) کی طرف سے ہو یا صرف عام دہشت گرد یا کسی بھی جانب سے۔' عدالت کو سکیورٹی کے ایک جائزے کے بارے میں بتایا گیا جس میں شہزادی حیا اور اس کے بچوں کے لیے خطرہ 'شدید' تھا۔ جج نے بعد میں خاندان کی نقل و حمل کے لیے بکتر بند گاڑیوں کے استعمال کے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے ایک فنڈ کی بھی قائم کرنے کا حکم دیا۔ ہائی کورٹ کے جج نے کہا کہ انھوں نے 'شادی کے دوران ان بچوں کی غیر معمولی دولت اور قابل ذکر معیار زندگی' کو دیکھتے ہوئے ایک معقول نتیجے پر پہنچنے کی پوری کوشش کی۔ انھوں نے کہا کہ اس نے کیس کا فیصلہ 'بالکل عام طریقے سے ہٹ کر' کیا ہے۔ شہزادی حیا کے وکلا نے اصرار کیا تھا کہ اس نے اپنی مستقبل کی ضروریات کے لیے کوئی دعویٰ نہیں کیا تھا لیکن عدالتی سماعت کے دوران ان کے شاہانہ اخراجات پر انھیں تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ مثال کے طور پر اس کے نو سالہ بیٹے کو تین مہنگی کاریں دی گئی ہیں کیونکہ وہ 'گاڑیوں کو تحفے میں دینے کا عادی تھا'۔ جج نے کہا کہ یہ ایک جائز تنقید تھی۔ فیصلے میں شہزادی حیا کی طرف سے فراہم کردہ شواہد بھی شامل ہیں کہ ان کے سکیورٹی کے عملے میں سے کچھ ارکان کے ساتھ ان کے تعلقات تھے اور اس بنا پر انھیں بلیک میل کیا گیا تھا۔ انھوں نے اس عملے میں سے چار افراد کو کئی مرتبہ بھاری رقم کی ادائیگیاں بھی کیں، جن میں سے کچھ ان کے بچوں کے بینک اکاؤنٹس سے حاصل کی گئی تھیں۔ شہزادی حیا کے مطابق اس معاملے کو حل کرنے کے لیے انھوں نے دس لاکھ پاؤنڈ سے زیادہ کی قیمت کے زیورات بیچے تھے اور اس کے بعد انھیں مزید قیمتی اشیا بھی فروخت کرنا پڑی تھیں۔ دبئی کے شیخ محمد نے کہا ہے کہ ان کی سابقہ اہلیہ کو دیے گئے خاندانی تحفے انھیں بھیج دیے جائیں گے۔ ان میں 'بیلے رقص کے جوتے' بھی شامل ہیں جو انھیں دنیا کے مشہور رقاص ڈیم مارگوٹ فونٹین اور روڈولف نوریف نے دیے تھے۔ شیخ محمد نے یہ بھی کہا کہ انھوں نے اس آن لائن نظم کو ہٹا دیا ہے جسے شہزادی نے اپنی زندگی کے لیے ایک خطرہ قرار دیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ ان کا شہزادی کو نقصان پہنچانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ❁❁❁

چھٹی قومی اہلِ قلم کانفرنس 2021

تحریر و تحقیق: ذوالفقار علی بخاری

دسمبر کا موسم اکثر انسان کو مبہوت کر دیتا ہے لیکن اس بار اس کے تیور کچھ اور ہی دکھائی دے رہے تھے کہ جونہی چھٹی قومی اہل قلم کانفرنس 2021 کا اعلان ہوا اس کے مزاج برہم ہو گئے اور ابر نے عین 26 دسمبر کو برسنا شروع کر دیا تھا لیکن اہل قلم بڑے دل کے ساتھ اس تقریب کے لئے الحمرہال، لاہور میں موجود تھے کہ اس کا براہ راست تعلق ہی ادیبوں کی پذیرائی جہاں تھا، وہیں بچوں کے حقوق کے تحفظ اور امن کے فروغ میں اہل قلم کے کردار پر بھی بات ہونی تھی جو اس خاص تقریب کا وہ موضوع تھا جس پر مدعو کیے گئے ادبی و سماجی شخصیات کو اظہارخیال کرنا تھا۔

میرے اولین ادبی دنیا کے استاد، اکادمی ادبیات اطفال کے چیئرمین اور مدیر ماہنامہ ''پھول'' محترم محمد شعیب مرزا نے جس طرح سے ادیبوں کی حوصلہ افزائی کا سلسلہ مسلسل چھے سالوں سے جاری رکھا ہوا ہے وہ اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ اس طرح کا اقدام کوئی بھی حکومت آج تک نہیں کر سکی ہے۔ انہوں نے جس طرح سے ادب اطفال ادیبوں کو درپیش مسائل کے حل کے لئے عمدہ تجاویز معاون خصوصی وزیر اعلیٰ پنجاب و ترجمان حکومت پنجاب حسان خاور صاحب کے روبرو رکھی ہیں وہ بہت کچھ بدل سکتا ہے اگر اُن پر عمل درآمد کو یقینی بنایا جاتا ہے۔

جناب حسان خاور از خود مطالعے کی طاقت سے بخوبی واقف ہیں اس وجہ سے اس بات کی توقع کی جارہی ہے کہ وہ ادب اطفال ادیبوں کا مقدمہ بھرپور انداز میں وزیر اعلیٰ پنجاب جناب عثمان بزدار صاحب کے سامنے پیش کریں گے تاکہ برسوں سے نظرانداز کیے جانے والے ادب اطفال ادیبوں کے نہ صرف معاشی حالات بدل سکیں بلکہ صوبے بھر میں مطالعے کو فروغ مل سکے۔ حسان خاور صاحب نے اہل قلم کو ان کی مخفی قوتوں کے حوالے سے خوب مثالوں سے واضح کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ ایک بہترین ترجمان ہونے کے ساتھ ساتھ ادب دوستی میں بھی کسی سے کم نہیں ہیں اور دل چسپ بات یہ ہے کہ بہترین انداز میں بات کو کہنے کا فن بھی جانتے ہیں۔ راقم السطور کو قوی یقین ہو چکا ہے کہ انہوں نے ادب اطفال ادیبوں کی ترجمانی وزیر اعلی پنجاب کے سامنے کر دی تو پھر نہ صرف ادیبوں کی کتب کی اشاعت و فروخت کا سلسلہ شروع ہو سکے گا بلکہ حکومتی سطح پر ان کو سراہنے کے لئے انعامات بھی دیے جائیں گے جس میں میرٹ کو یقینی بنایا جائے گا تاکہ ادب اطفال ادیبوں کو اُن کا جائز حق دیا جا سکے۔

بہرحال، چھٹی قومی اہل قلم کانفرنس 2021 میں شرکت راقم السطور کے لئے یوں دل چسپ تھی کہ 2020 میں ہونے والی پانچویں عالمی اہل قلم کانفرنس کے موقع پر بہت کم ادبی دنیا کے افراد نام سے شناسائی رکھتے تھے لیکن محض ایک سال کے عرصے میں اب کی بار کوئی ایسا ادیب نہیں تھا جو ناواقفیت کا اظہار کرتا اس کی بڑی وجہ یہی تھی کہ راقم السطور نے اپنی انفرادیت کا اظہار مختلف انداز میں پیش کر دیا تھا بلکہ نوجوان قلم کاروں کی بھرپور انداز میں حوصلہ افزائی بھی کی تھی جس کی وجہ سے شناسائی زیادہ

ہو چکی تھی۔ اسی وجہ سے راقم السطور کو دل چسپ انداز میں بہت کچھ سننے کو ملا:

ارے آپ ہیں ذوالفقار بخاری؟ آپ کا بہت چرچا سنا ہے؟ آپ ماشاءاللہ اچھا کام کر رہے ہیں؟ آپ کالم نویس ہیں بہت اچھا لکھتے ہیں؟ آپ استاد ہیں واقعی استاد ہیں؟ آپ کے شاگرد بھی ہیں؟ سر ذوالفقار؟ بخاری صاحب؟

چھٹی قومی اہل قلم کانفرنس 2021 میں یہ سب وہ سنے گئے الفاظ ہیں جنہوں نے جہاں حوصلہ بلند کیا ہے وہیں بہت کچھ سمجھایا بھی ہے کہ ادیب واقعی بہت بڑی تبدیلی لا سکتے ہیں اگر وہ بچوں کی کردار سازی ایسی کریں کہ معاشرہ امن کا گہوارہ بن جائے۔ میرے خیال میں محمد شعیب مرزا صاحب کی جانب سے شروع کیے جانے والے اس منفرد سلسلے سے جتنا فائدہ آج ادب اطفال کے لئے نئے لکھنے والوں کو ہو رہا ہے اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا ہے کہ اس کی بدولت ملنے والی حوصلہ افزائی قلم سے رشتہ مسلسل قائم رکھنے پر مائل کر رہا ہے جو کہ بہت بڑی کامیابی کہی جا سکتی ہے، اس حوالے سے راقم السطور کی ذات کو بطور مثال دیکھا جا سکتا ہے یہ خوش فہمی سے زیادہ حوصلہ افزائی کا ثمر ہے کہ اس طرح سے کئی نئے لکھنے والے اُبھر کر سامنے آرہے ہیں جس کی ماضی میں کوئی مثال دیکھنے کو نہیں ملتی ہے۔ چھٹی قومی اہل قلم کانفرنس 2021 کا انعقاد بے حد متاثر کن رہا ہے کم سے کم مجھے ذاتی طور پر معزز مہمانوں حسان خاور، بشریٰ رحمن، ڈاکٹر فضیلت بانو، تسنیم جعفری، مسرت کلانچوی، حفیظ طاہر، سید احمد ندیم قادری، ڈاکٹر عمران مرتضی، ڈی جی لوکل گورنمنٹ پنجاب کوثر خان، چائلڈ پروٹیکشن آفیسر پنجاب اضلان بٹ اور تقریب کے روح رواں محمد شعیب مرزا کی جانب سے کہی جانے والی باتوں اور تجاویز نے بہت حیرت زدہ کیا ہے کہ انہوں نے آج کے دور میں نہ صرف ادیبوں کے حقوق اور فرائض پر بات کی بلکہ بچوں کی تربیت کن امور پر کرنی چاہیے کو اپنے تجربات کی روشنی میں بیان کیا۔ بچوں کی پیدائش کے اندراج کے حوالے سے بھی محکمہ بلدیات پنجاب کے عہدیداران نے گراں قدر معلومات فراہم کیں اور قلم کاروں سے درخواست کی کہ وہ بچوں کی پیدائش کے اندراج کے سلسلے میں اپنا کردار ادا کریں تاکہ بچوں کو ان کے حقوق مل سکیں۔ ''حکومت پنجاب ادیبوں کو ان کا جائز مقام دے گی اور آرٹسٹ سپورٹ فنڈ میں بچوں کے ادیبوں کو بھی شامل کیا جائے گا۔ کیونکہ بچوں کے ادیب نئی نسل کی کردار سازی کا اہم فریضہ انجام دیتے ہیں''۔

ان خیالات کا اظہار معاون خصوصی وزیر اعلیٰ پنجاب و ترجمان حکومت پنجاب حسان خاور نے لاہور آرٹس کونسل' اکادمی ادبیات اطفال' یونیسف' محکمہ بلدیات پنجاب اور پنجاب آرٹس کونسل کے اشتراک سے الحمراء (لاہور) میں منعقدہ چھٹی

قومی اہل قلم کانفرنس میں ملک بھر سے آئے ہوئے ادیبوں سے کر کے راقم السطور کے دل کو جیت لیا۔انہوں نے مزید یہ بھی کہا کہ " حکومت بچوں کی فلاح و بہبود کا فریضہ احسن طریقے سے انجام دے رہی ہے۔بہت جلد بچوں کے ادیبوں کے وفد کی وزیر اعلیٰ پنجاب سے ملاقات کا اہتمام کیا جائے گا"۔ڈائریکٹر جنرل آپریشنز نوائے وقت کرنل(ر) سید احمد ندیم قادری نے کہا کہ " موجودہ حالات میں والدین اور اساتذہ کو بچوں کی تربیت پر خصوصی توجہ دینی چاہیئے۔بچوں کے ادیب نہایت اہم فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ادب کے ذریعے بہت مثبت تبدیلیاں لائی جاسکتی ہیں"۔

نامور ادیبہ بشریٰ رحمان صاحبہ اور ڈاکٹر فضیلت بانو، سید احمد ندیم قادری نے مطالعے کے فروغ اور کتب بینی پر بچوں کی توجہ مرکوز کروانے کے حوالے سے جو باتیں کہیں اگر اُن پر قلم کاروں نے تحریروں کے ذریعے شعور بیداری کی مہم چلائی تو یقینی طور پر واضح تبدیلی دیکھنے کو مل سکتی ہے۔مدیر ماہنامہ "پھول" اور اکادمی ادبیات اطفال کے چیئرمین محمد شعیب مرزا نے کہا کہ " اس سرد موسم میں آزاد کشمیر ' بلوچستان اور ملک بھر سے ادیبوں کی اس کانفرنس میں شرکت ان کے جذبے کی مثال ہے۔حکومت کو چاہیئے کہ دیگر شعبوں کی طرح بچوں کے ادب پر بھی سول ایوارڈ دیئے جائیں"۔اس تقریب میں محترمہ بشریٰ رحمن ' کوثر خان ' اضلان بٹ ' ڈاکٹر عمران مرتضیٰ ' حفیظ طاہر ' پروفیسر مسرت کلانچوی ' محمد امجد حسین ' ڈاکٹر فضیلت بانو ' وسیم عالم ' تسنیم جعفری ' شہزادا ے حمید ' سجاد منیر اور دیگر ادبی وسماجی شخصیات نے بھی خطاب کیا تھا۔چھٹی قومی اہل قلم کانفرنس 2021 میں راقم السطور کی کئی قلم کاروں سے ملاقات یادگار ہو چکی ہے اور نئے لکھاریوں خاص طور پر فاکہہ قمر صاحبہ، ہما مختار احمد کے پُرجوش لہجوں نے یہ تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا ہے کہ اگر ادیبوں کو یونہی اس اہل قلم کانفرنس سے مزید حوصلہ افزائی اور پذیرائی ملتی رہی تو ادب اطفال کو مزید عروج حاصل ہوگا۔اپنے اولین ادبی دنیا کے استاد جناب محمد شعیب مرزا صاحب سے ملنا اور ان کو " آپ بیتیاں " کتاب کا تحفہ دینا یادگار لمحہ ہے، وہیں ادب اطفال کے معمار جناب نذیر انبالوی صاحب کی پُرمغز گفتگو سننا ایک انمول تحفہ ہے۔قابل احترام نذیر انبالوی صاحب کی باتوں نے دل موہ لیا اور جناب محمد نوید مرزا صاحب کا پذیرائی کرنا بہت انمول ہے۔اپنے بہترین ادبی دنیا کے دوست ملک محمد احسن، محمد شاہد اقبال، محمد فرحان اشرف، ڈاکٹر طارق ریاض، غلام زادہ نعمان صابری، محمد توصیف ملک، حسن اختر، تسنیم جعفری صاحبہ، شمیم عارف صاحبہ، عطرت بتول صاحبہ، غلام زہرا صاحبہ، توقیر کھرل، فلک زاہد صاحبہ، محمد برہان الحق اور امان اللہ نیر شوکت صاحب سے ملنا خوشگوار تجربہ رہا ہے۔ڈاکٹر طارق ریاض صاحب کا نام بہت بار سنا لیکن پہلی بار ملنا ایسا ہوا کہ گرویدا ہو گیا ہوں کہ انہوں نے عملی طور پر ثابت کیا ہے کہ حقیقی ادیب کیسا ہوتا ہے ان کی خدمت میں اپنی آپ بیتی کا رسالہ بطور تحفہ پیش کیا۔ڈاکٹر صاحب کے چہرے کی مسکراہٹ بے حد پسندیدہ رہی ہے۔بشریٰ رحمن صاحبہ سے ایوارڈ وصول کرنا راقم السطور کے لئے باعث مسرت تھا کہ مسلسل دوسرے سال ادب اطفال ایوارڈ حاصل کیا ہے۔جناب محمد شعیب مرزا صاحب نے ایک بار پھر یہ ثابت کر دیا ہے کہ اگر ہمت کے ساتھ کوئی کام کرنے کا سوچ لیا جائے تو پھر کوئی رکاوٹ آپ کو اچھے کام کرنے سے نہیں روک سکتی ہے۔اس حوالے سے ان کے ساتھیوں کا خصوصی تعاون بھی اس تقریب کو کامیابی سے ہمکنار کر گیا ہے۔نذیر انبالوی، فلک زاہد، حسن اختر، ڈاکٹر فوزیہ سعید، تسنیم جعفری صاحبہ، فاکہہ قمر اور ابھرتی ہوئی نوجوان لکھاری ہما مختار احمد کے نام ضرور لینا چاہوں گا کہ ان کو ایوارڈ حاصل کرتے دیکھنا پُرمسرت لمحات تھے۔ادب اطفال ایوارڈ، تسنیم جعفری ایوارڈ اور ڈاکٹر عبدالقدیر خان ایوارڈ اس تقریب میں خوش نصیب قلم کاروں اور شعراء کو سماجی وادبی خدمات پر دیا گیا جو مزید بہترین کارکردگی دکھانے پر مائل کرے گا۔

اس محفل میں شرکاء کی تواضع بھی بھرپور انداز میں کی گئی تھی، اُن کو جہاں قلم کاروں سے ملاقات کا موقع ملا وہیں مدیران اور نامور شخصیات سے بھی ملے ہیں اور بہت کچھ سیکھا ہے تقریب کے اختتام پر سب مہمانوں کا شکریہ ادا کیا گیا جس کے بعد سب شرکاء ایک حسین یاد کے ساتھ واپس روانہ ہو گئے اور یوں چھٹی قومی اہل قلم کانفرنس 2021 ایک خوبصورت یاد کی مانند ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گئی۔۔ ❁❁❁

عرب خطے کا سب سے بڑا چرچ عوام کیلئے کھول دیا گیا

بحرین: عرب دنیا جس میں بحرین، امارات، یمن، سعودی عرب، قطر، کویت عمان اور عراق واُردن کے کچھ علاقے شامل ہیں، میں اب تک کے سب سے بڑے کیتھولک چرچ کا افتتاح ہوگیا ہے۔کیتھڈرل آف آر لیڈی آف عربیہ نامی یہ چرچ بحرین میں تعمیر کیا گیا ہے۔بحرین کے رہائشی اور چرچ کے پادری شربل فیاض کا کہنا ہے کہ ہم اس چرچ کیلئے بہت خوش ہیں۔یقیناً یہ لوگوں کی روحانی صحت وضروریات کیلئے سودمند ثابت ہو گا۔

اس چرچ میں 2300 افراد کی جگہ ہے۔یہ چرچ مسلم اکثریتی خطے کی عیسائی اقلیت کو مدِنظر رکھتے ہوئے بنایا گیا ہے تاہم پادری شربل نے کہا ہے کہ یہ عیسائی اور غیر عیسائی دونوں کیلئے ہے کیونکہ ہر انسان خدا کا بندہ ہے۔ویٹی کن کے اعداد و شمار کے مطابق بحرین میں 80000 کیتھولک عیسائی موجود ہیں جن میں سے زیادہ تر ایشیائی ممالک بھارت اور فلپائین سے آئے ہوئے ہیں۔ (بشکریہ ایکسپریس میڈیا گروپ) ❁❁❁

امروہے والے ماموں اور کراچی والے چچا

تحریر: مبشر علی زیدی

کیا یہ بات کسی اعزاز سے کم ہے کہ آپ کا نام اور جون ایلیا کا نام کسی رسالے میں ایک ساتھ شائع ہو؟ میں ابھی اسکول میں پڑھتا تھا کہ لیٹر ٹو دی ایڈیٹر لکھنا شروع کر دیے۔ اِدھر اُدھر تو بھیجتا ہی تھا، سسپنس ڈائجسٹ کو بھی بھیجنے لگا۔ کبھی سوچا نہیں تھا کہ ایک دن اس ادارے میں بیٹھ کر دوسروں کے خطوط چھانٹوں گا۔ لیکن وہ بہت بعد کا واقعہ ہے۔ اسکول کالج کے دنوں میں خط بھیجتا رہا اور چھپتے رہے۔ اب پلٹ کر دیکھتا ہوں کہ ان دنوں سسپنس کا آغاز جون ایلیا کے انشائیے سے ہوتا تھا اور کہانیوں سے پہلے قارئین کے خطوط والے صفحات پر چند سطروں کے ساتھ میرا نام چھپ جاتا تھا۔ چھ محرم کی ایک سہ پہر بھی یاد ہے کہ جب کراچی کے علاقے رضویہ میں امروہے والوں کا جلوس مقررہ راستوں پر رواں دواں تھا۔ آگے آگے جون ایلیا اور ان کے مصرعہ بردار۔ پیچھے پیچھے، ننگے پاؤں یہ عزادار۔ جون صاحب اپنی زندگی میں ہی افسانہ بن گئے تھے۔ امروہے والے ان کے کچھ اور قصے سناتے تھے، باہر والے کچھ اور۔ امروہے والے اپنے سوا پوری دنیا کے سات ارب پندرہ کروڑ افراد کو باہر والا کہتے ہیں۔ میرے دادا اور نانا امروہے کے نجیب الطرفین سید تھے اس لیے مجھے اندر کا آدمی سمجھیے۔ ایک بار گھر میں تذکرہ ہوا تو میرے ماموں نے بتایا کہ وہ اور جون صاحب امروہے میں ہم جماعت تھے۔ آٹھویں تک دونوں کا ساتھ رہا۔ جون ایلیا اس وقت بھی سکہ بند شاعر تھے۔ جون صاحب سے میری کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ میں نے جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز، وہ ادارہ جو سسپنس ڈائجسٹ چھاپتا ہے، میں نوے کی دہائی میں وقفے وقفے سے دو بار ملازمت کی لیکن جون صاحب کو کبھی وہاں نہیں دیکھا۔ ان دنوں جاسوسی کا دفتر رمضان چیمبرز میں تھا۔ یہ عمارت آئی آئی چندریگر روڈ پر روزنامہ جنگ کی عقبی گلی میں ہے۔ جنگ کی اپنی گلی میں پریس چیمبرز نام کی عمارت ہے جہاں سب رنگ ڈائجسٹ کا دفتر تھا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ جون ایلیا کا بہت سا وقت سب رنگ کے دفتر میں شکیل عادل زادہ کے ساتھ گزرا۔

جون صاحب کے انتقال کے دس سال بعد میں نے اس دفتر میں جانا شروع کیا۔ وہاں شکیل صاحب کے علاوہ ان کے مہمان اور پرستار انیق احمد سے بھی ملاقات ہو جاتی تھی۔ میں دونوں سے کرید کرید کر جون صاحب کے بارے میں دریافت کرتا تھا۔ شکیل عادل زادہ اور انیق احمد کے پاس جون صاحب کی بہت یادیں ہیں۔ ان کا بہت وقت جون صاحب کی نازبرداری میں گزرا۔ وہ ان کی بہت سی شاعری کے پس منظر سے واقف ہیں۔ خدا بھلا کرے خالد احمد انصاری کا، جنھوں نے نہ صرف جون ایلیا کی شاعری بلکہ سسپنس کے انشائیوں سمیت ان کی نثر بھی کتابی صورت میں چھاپ دی۔ میں نے شاید، یعنی، گمان، لیکن اور گویا کے عنوان سے شعری مجموعے اور فرنود کے نام سے نثر کی کتاب حفظ کر لی۔ اب مجھے کچھ کچھ جون ایلیا سمجھ آنے لگے۔ لیکن جون صاحب کی شاعری اور نثر پڑھنے اور ان کے دوستوں کی گفتگو سننے کے باوجود کچھ کسر باقی تھی، کچھ سوال تشنہ تھے، کچھ کہانیاں وضاحت طلب تھیں۔ گھر کی گواہی باقی تھی۔ ایسے میں رئیس امروہوی کی منجھلی بیٹی شاہانہ نے چچا جون کے نام سے اپنی یادداشتیں لکھ دیں۔ یہ کتاب گزشتہ ماہ شائع ہوئی ہے اور جون ایلیا کو بازار میں لے آئی ہے۔ جون ایلیا کے پہلے مجموعہ کلام شاید کا دیباچہ اردو کے بہترین نثر پاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے والد شفیق حسن ایلیا کا ذکر کیا، امروہے سے ہجرت پر دکھ کا اظہار کیا اور اپنی تلخ زندگی کی چند جھلکیاں دکھائی تھیں۔ شاہانہ رئیس ایلیا ہمیں اپنے ساتھ امروہے لے جاتی ہیں۔ وہ ہماری ملاقات شفیق حسن ایلیا اور ان کی محروم اور مجبور بیوی سے کراتی ہیں۔ میں جنگ کے پہلے ایڈیٹر سید محمد تقی کے بارے میں بھی جاننا چاہتا تھا لیکن ان کی بس پرچھائیں دکھائی دی۔ رئیس امروہوی سے سرسری ملاقات ہوئی لیکن جون ایلیا اپنی تمام تلخ نوائی اور شدید اذیت پسند طبعیت کے ساتھ کھل کر سامنے آ گئے۔ شاہانہ صاحبہ نے یہ کتاب جون ایلیا کو مخاطب کر کے لکھی ہے۔ یوں کہ جیسے وہ اپنے چچا کو سب باتیں سنا رہی ہیں۔ یہ یادداشتیں مرتب کرنے کا انوکھا انداز ہے۔ کتاب قاری کو مخاطب کر کے لکھی جاتی ہے، کسی دوسرے کو مخاطب کرنے میں یہ خطرہ رہتا ہے کہ قاری لاتعلق نہ ہو جائے۔ لیکن کم از کم میرے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ کہیں کہیں تو یوں لگا کہ شاہانہ درمیان سے نکل گئی ہیں جس کے بعد میں اور جون صاحب ایک دوسرے کو حیرت سے تکتے رہ گئے۔

جون صاحب نے کتنے عشق کیے، شادی کیوں ناکام ہوئی، مکان بیچنے کا قصہ کیا تھا، ان سے ملنے کو آنے والی ایک لڑکی نے کیوں خودکشی کر لی، یہ سب واقعات پڑھنے والا دم بخود رہ جاتا ہے۔ ایک واقعہ، جس کے مرکزی کردار جون صاحب نہیں، پڑھ کر میں بے حد افسردہ ہوا۔ اس سے پہلے یہ سنیں کہ میری نانا اور نانی تقسیم ہند کے بعد امروہے سے پاکستان آ گئے تھے۔ نانی اماں کے واحد سگا بھائی امروہے ہی میں رہے۔ میری والدہ قیام پاکستان کے بعد یہاں پیدا ہوئیں۔ ایک بار میں نے امی سے پوچھا کہ کیا آپ کی کبھی اپنے سگے ماموں سے ملاقات ہوئی ہے۔ انھوں نے کہا، نہیں۔ اس نہیں میں بہت عجیب سی حسرت تھی۔ میں نے دیکھا کہ نانی اماں اکثر اپنے بھائی کو یاد کر کے روتی تھیں۔ دونوں طرف غربت کا یہ عالم تھا کہ نہ کبھی نانی امروہا جا سکیں اور نہ ان کے بھائی پاکستان آ سکے۔ 1984 کی ایک دوپہر کراچی سے آنے والے ایک مہمان نے بتایا کہ نانی کے بھائی کا امروہے میں انتقال ہو گیا۔ یہ خبر سن کر اماں کیسے تڑپ کر روئیں، میں بیان نہیں کر سکتا۔ یہ بظاہر غیر متعلق بات میں نے اس لیے لکھی ہے کہ میں بچھڑے ہوئے خاندانوں کا دکھ جانتا ہوں، اسے محسوس کر سکتا ہوں۔ شاہانہ صاحبہ نے لکھا ہے کہ رئیس امروہوی پاکستان آ گئے اور ان کی والدہ امروہے میں رہ گئیں۔ وہ وہاں فریاد کرتی رہیں لیکن نہ ان کے شوہر انھیں پاکستان لائے، نہ رئیس امروہوی نے ماں کی خبر لی۔ بوڑھی ماں برسوں تڑپ تڑپ کر مر گئی۔ بہت سال بعد جب رئیس صاحب امروہے گئے تو دیواروں سے لپٹ لپٹ کر، تڑپ تڑپ کر ویسے ہی روئے۔ میں کتاب پڑھتا جاتا تھا اور اپنی نانی اماں کی تڑپن یاد آتی جاتی تھی۔ شاہانہ رئیس ایلیا کے منفرد انداز تحریر، رئیس اور جون جیسے انوکھے کرداروں، امروہے والوں کی منفرد روایات کے تذکروں اور ہجرت کرنے اور نہ کرنے والوں کی دکھ بھری کہانیوں نے اس کتاب کو ناقابل فراموش بنا دیا ہے۔ ❁❁❁

ترکی بہ ترکی کا محاورہ ایران میں رائج نہیں

تحریر: ڈاکٹر محمد سلیم

ترکی بہ ترکی بھلے فارسی ترکیب ہو لیکن فارسی، خاص طور سے ایرانی فارسی، میں رائج نہیں ہے، بلکہ یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ یہ خالص ہندوستانی محاورہ ہے۔ ترک سلاطین اور مغلوں کے دور میں دہلی اور آگرہ والے ہندی بولتے تھے لیکن لکھنے پڑھنے کا کام فارسی میں ہوتا تھا سرکاری زبان فارسی سہی، لیکن شاہی محل میں اور دوسرے مغل امراء کی حویلیوں میں بچوں کی پرورش ترک مامائیں کرتی تھیں اور انھیں ترکی زبان سکھائی جاتی تھی۔ کم از کم جہانگیر کے عہد تک تو ضرور ایسا تھا۔ اس طرح اشرافیہ کا ایک محدود طبقہ ترکی میں گفتگو کرسکتا تھا۔ جو چیز اشرافیہ سے متعلق ہوتی ہے، قابل رشک ہوجاتی ہے مثلاً سوڈیڑھ سو سال پہلے تک امیر کبیر بڑے لوگ ولایت سے پڑھ کر لوٹتے تھے اور انگریزی بولتے تھے۔ معاشرہ امیروں کے عیب وہنر اور دیگر خصوصیات کو اپنانے کی کوشش کرتا ہے۔ لوگ امیروں کی نقل کھانے پینے پہننے میں کرتے ہیں۔ ان خصوصیات میں ایک زبان بھی ہے۔ اگر کسی غریب کا بچہ انگریزی کا جواب انگریزی میں دے لیتا ہو تو یہ اس کے اور اس کے والدین کے لئے باعث فخر ہوتا ہوگا اور دوسروں کے لئے رشک کی بات تھی۔ پہلے کسی زمانے میں جب انگلستان میں انگریزی صرف جاہل گنوار بولتے تھے اور اشرافیہ کی زبان فرانسیسی تھی تو لوگوں کو فرانسیسی سیکھنے بولنے پر فخر کا احساس ہوتا تھا۔ حیثیت والے اپنے بچوں کو فرانس بھیجتے تھے۔ انگریزی کے بابائے شعروسخن چاسر نے میڈم ایگلنٹائن پر اس حوالے سے بھی طنز کیا ہے کہ وہ فخریہ فرانسیسی بولتی پھرتی ہے لیکن دراصل اس کے لہجے سے ظاہر ہوجاتا ہے کہ اس نے فرانس جاکر زبان کی تعلیم نہیں لی ہے بلکہ مقامی گرامر سکول میں ہی تھوڑی بہت سیکھ لی ہے۔ میرے سکول جانے کا چوتھا سال تھا اور قالینوں کے کاروبار کے سلسلے میں بیلجیئم سے کچھ انگریز (کہیں کا گورا ہو ہم اسے انگریز ہی سمجھتے تھے۔ جس طرح ابن الاثیر الشیبانی نے صلیبی جنگوں کی تاریخ میں سارے عیسائیوں کو فرنج کہا ہے) میرے گھر آئے تھے۔ پینتیس چالیس برس پہلے کی بات ہے۔ میں طالب علم تو چھٹی جماعت کا تھا، لیکن ابا کے ایک دوست شیخ عبدالجبار شیرازی اللہ رحمہا جنھوں نے ولایت سے وکالت کی تعلیم مکمل کی تھی، مجھے اپنے گھر بلاکر انگریزی پڑھاتے تھے۔ گھر کیا تھا، سینکڑوں کمروں اور باغات پر مشتمل پورا محلہ تھا۔ آج بھی میرے شہر مرزاپور کی عدالت میں ان کی آدم قد تصویر لگی ہوئی ہے۔ بڑے عابد زاہد اور اردو فارسی کے عالم تھے۔ ترجمہ کے ذریعہ انگریزی سکھاتے جواب ناقص طریقہ سمجھا جاتا ہے۔ چھٹی جماعت کے بچے کو "اگر ہم باغباں ہوتے تو گلشن کو لٹادیتے" قسم کے جملوں کا ترجمہ کرنے کو کہتے جو میں نہ کرپاتا۔ لیکن روزمرہ جملے بنالیتا تھا اور ہر وقت اس چکر میں رہتا تھا کہ گھر میں کسی کو نیا جملہ سناؤں اور وہ میری تعریف کرے اور ایک آدھ روپیہ دے دے۔ آپ کو انگریزی (یا کوئی بھی زبان) تب تک بہت آتی ہے جب تک سامنے والے کو نہ آتی ہو۔ ایک گاؤں میں ایک لڑکا بابو بڑا انگریزی داں تھا۔ گاؤں والوں سے ہر وقت انگریزی بگھارتا رہتا تھا۔ ایک دن ایک گورا مسافر راستہ بھٹک گیا اور لوگوں سے راستہ پوچھنے کی کوشش کی لیکن جن سے پوچھتا وہ انگریزی نہ سمجھ پاتے۔ ایک نے انگریز کا ہاتھ پکڑا اور گاؤں میں لے گیا کہ آؤ بڑی انگریزی جھاڑ رہے ہو، ہمارے ببوا سے بات کرو۔ وہ تم سے بھی زیادہ انگریزی جھاڑ سکتا ہے۔ بھولے بھالے گاؤں والوں کے لئے بات راستہ پوچھنے بتانے تک محدود نہ تھی، بلکہ مقابلہ تھا، عزت کی بات تھی۔ خیر انگریز نے گاؤں کے بابو کو اپنی پریشانی بتائی اور راستہ پوچھا۔ بابو نے کہا یس یس، گڈ گڈ۔ اس نے پھر پوچھا۔ کہا یس یس بٹ تھینک یو تھینک یو۔ پھر پوچھا۔ پھر یس نوبکا زویری ویری گڈ۔ انگریز حیرت سے پریشان اور گاؤں والے فخریہ اپنے بابو کو دیکھ رہے تھے۔ اتنی انگریزی بول رہا تھا کہ انگریز کو بھی پسینہ آ گیا تھا۔ آخر کار انگریز نے ایک طمانچہ رسید کیا اور چلتا بنا۔ اب حیرت کے پتلے گاؤں والے تھے۔ پوچھا بابو تم بول تو رہے تھے انگریزی، مارا کیوں اس نے؟ بابو نے کہا کہ وہ کہہ رہا تھا کہ تم ایسی اچھی انگریزی بولتے ہو، یہاں کیا کر رہے ہو۔ چلو میرے ساتھ انگلستان۔ وہاں انگریزی پڑھانا۔ میں نے منع کردیا تو ناراض ہوگیا۔ ابا کی کمپنی میں ایک ملازم انور بھائی تھے جو کسی سوشلسٹ سیاسی جماعت سے وابستہ تھے اور رکشہ تانگہ والوں کے لیڈر تھے۔ زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے لیکن انہیں تقریر کرنے کا بڑا ہیضہ تھا۔ خود کو اچھا مقرر سمجھتے تھے۔ اسی طرح میری 'انگریزی دانی' کے بھی قائل تھے۔ انہوں نے مجھے اکسایا کہ انگریزوں سے انگریزی میں کچھ بات کروں۔ تو صاحبو، مجھے بھی بیلجیئم سے آئے 'انگریزوں' سے بات کرنی پڑی۔ میں بہت خوش تھا کہ صرف ابا ہی نہیں ملازمین اور آٹھ دس دوسرے تاجران شہر مجھے انگریزی داں سمجھ رہے ہوں گے اور میری تعریفیں کریں گے۔ آخر میں بھی انگریزی کا جواب انگریزی میں دے سکتا تھا۔ اب آپ سلاطین کے عہد کا تصور کیجئے۔ کوئی ترکی بول رہا ہو تو بڑا آدمی ہوگا۔ اور اگر آپ ترکی کا جواب ترکی میں دے سکیں تو یہ بھی بڑی بات ہوئی۔ اور ایسے موقع پر ترکی نہ جاننے کا افسوس بھی ہوتا ہوگا کہ من ترکی نمی دانم۔ یہ فقرہ ترکی بہ ترکی اسی طرح شروع ہوا ہوگا۔ دھیرے دھیرے معنی میں وسعت پیدا ہوجاتی ہے۔ کسی کو اسی کی زبان میں اسی لہجہ میں جواب دینا، جیسے کو تیسا وغیرہ۔ لیکن جب دو ترک، دو ہم پلہ افراد ایک ہی زبان ولہجہ میں گفتگو کریں تو اس میں ایسی کوئی خاص بات نہیں کہ اس کو ترکی بہ ترکی کہا جائے۔ ترک فاتح تھے، بڑے تھے، اس لئے ترکی کا رعب ہونا فطری بات ہے۔ تو بات تو تب ہوئی جب غیر ترک ترک کا ترکی میں جواب دے یعنی مرعوب رعب سے، چھوٹا بڑے سے اسی لہجے میں تڑاتڑ جواب دے تو کہتے ہیں ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ اس لئے مجھے سمجھ نہیں آیا کہ میراجی کے یہاں بہو کے بجائے ساس ترکی بہ ترکی کیوں بول رہی ہے:

بہو کہے جی جو آتا تھا ساس کے سامنے بول رہی تھی
ساس بھی لیکن ترکی بہ ترکی بھید بہو کے کھول رہی تھی

لغت نویسوں نے ترکی کے معنی مردانگی، بہادری، غرور وگھمنڈ وغیرہ بھی درج کیے ہیں لیکن ایسا کبھی نہیں سنا کہ وہ بڑی ترکی سے لڑا یا اس نے بڑی ترکی دکھائی۔ البتہ ایسا ضرور ہوتا ہے کہ سامنے والا سوا پڑ جاتا ہے اور آپ کا گھمنڈ چور ہوجاتا ہے، بھرم ٹوٹ جاتا ہے۔ سب ختم ہوجاتا ہے۔ جب بیلجیئم سے آئے گوروں سے میں نے چند انگریزی جملے کہے تو انھوں نے اپنے مخصوص لہجہ میں نہ معلوم کیا کیا کہا، میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ میری سٹی پٹی گم ہوگئی، شرم سے پانی پانی ہوا جارہا تھا۔ میں گاؤں کا بابو تھا نہ حاضرین گاؤں والے، اس لئے خاموش رہا۔ جتنے جملے جانتا تھا سب کہہ چکا تھا۔ میری انگریزی تمام ہوگئی تھی۔ پہلے ایسی صورت میں انگریزی نہیں ترکی تمام ہوتی ہوگی۔ پھر وہی معنی میں وسعت۔ الفاظ کم پڑجائیں، فن عاجز ہوجائے یا بہادری اور ہیکڑی نکل جائے تو کہتے ہیں ترکی تمام ہوگئی۔

نگہ ناز کام کرتی ہے   دم میں ترکی تمام کرتی ہے

❁❁❁

حبیب جالب: ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

تحریر: شاہد صدیقی

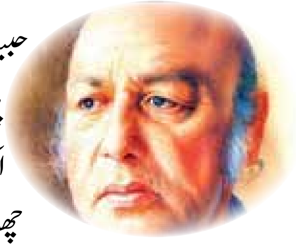

حبیب جالب سے میرا تعارف اُس وقت ہوا جب میں پرائمری کلاس میں پڑھتا تھا۔ ہم ان دنوں راولپنڈی کے ایک معروف علاقے ٹینچ بھاٹہ میں رہتے تھے۔ یہ ایک چھوٹا سا گھر تھا جس میں ایک مختصر برآمدہ اور کچا صحن تھا' جس میں میٹھے رسیلے شہتوت کا ایک درخت تھا۔ ہمارے گھر کے سامنے دور دور تک کھیت پھیلے ہوئے تھے اور بائیں طرف ایک وسیع میدان تھا' جہاں مجھ سے بڑی عمر کے لڑکے کھیلنے آتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ٹیلی ویژن اور ٹیلی فون گھر گھر نہیں پہنچے تھے اور موبائل فون کا تصور بھی ہمارے حاشیہ خیال میں کبھی نہیں آیا تھا۔ گرمیوں کی شاموں میں گھر کے باہر کچی زمین پر کُرسیاں بچھ جاتیں اور گرمی کی شدت کم کرنے کیلئے پانی کا چھڑکاؤ کیا جاتا۔ کُرسیوں پر گھر کے بڑے بیٹھتے ہم بچے آتے جاتے کچھ دیر رُکتے اُن کی باتیں سنتے اور پھر کھیل میں مصروف ہو جاتے۔ اُردو ادب سے میری دلچسپی کی بڑی وجہ گھر کا ماحول تھا۔ میرے والد اُردو، فارسی اور پنجابی کے شاعر تھے۔ والدہ کو پڑھنے کا شوق تھا۔ انہی دنوں میرے بڑے بھائی اور ماموں ایم اے اُردو کا امتحان دے رہے تھے۔ انہوں نے پڑھائی کیلئے گھر کے قریب ایک کمرہ کرائے پر لیا ہوا تھا' جہاں وہ کتابوں کے ڈھیر میں پڑھا کرتے تھے یہیں سے مجھے مطالعے کا شوق پیدا ہوا۔ گھر میں کتابوں اور رسالوں کی فراوانی تھی۔ یوں میں کم عمری میں ہی شعر و ادب کے ذائقے سے آگاہ ہو چکا تھا۔ شعر و ادب سے اوائل عمری میں آشنائی حبیب جالب کو جاننے کا باعث بنی۔ ایک روز میں نے سُنا ہمارے گھر کے بڑے ہمیشہ کی طرح گھر کے باہر کچی زمین پر کرسیاں ڈالے بیٹھے ہیں اور ایک نوجوان شاعر حبیب جالب کا ذکر ہو رہا ہے جس نے مری کے ایک سرکاری مشاعرے میں حکومت مخالف نظم سُنا کر ایک ہلچل مچا دی تھی۔ سب اس کی جرأت اور حوصلے پر حیران ہو رہے تھے۔ میرے ننھے سے ذہن میں حبیب جالب کا نام چپک کر رہ گیا۔

بہت بعد میں جب میں ہائی سکول پہنچا تو ان کے بارے میں مزید جاننے کا موقع ملا کہ حبیب جالب 1928 میں ضلع ہوشیار پور کے ایک گاؤں میانی افغاناں میں پیدا ہوئے تھے۔ جالب کے گھر پر مستقل غربت اور مفلسی کے سائے تھے۔ بارشوں میں گھر کی کچی چھت ٹپکنے لگتی لیکن اس افلاس میں امید کی کرن علم و ادب کی روشنی تھی۔ ان کے والد صوفی عنایت لکھنے پڑھنے کے رسیا تھے۔ ان کی جوتوں کی دکان تھی۔ ننھے جالب کو سکول داخل کرایا گیا۔ جالب کے گھر کے افراد دہلی چلے گئے تھے لیکن وہ اپنی نانی کے پاس گاؤں میں رک گیا تھا۔ جالب کی نانی کی نظر تقریباً ختم ہو چکی تھی لیکن خاندانی وقار کا تقاضا تھا کہ وہ کسی کے سامنے دستِ طلب دراز نہ کریں۔ وہ گھر میں ازار بند اور جرابیں بناتی تھیں۔ پھر وہ اور کم سن جالب ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے گلیوں میں ازار بند اور جرابیں فروخت کرتے۔ اسی غربت کے عالم میں جالب نے گاؤں کے سکول میں سات جماعتیں پاس کیں اور پھر وہ بھی دہلی چلے گئے' جہاں ان کے گھر کے دوسرے افراد رہتے تھے۔

اسی دوران پاکستان بننے کی تحریک عروج پر پہنچ گئی اور پھر 14 اگست 1947ء کو پاکستان وجود میں آ گیا۔ اسی سال جالب اور اس کے گھر والے بھی دہلی چھوڑ کر اپنے خوابوں کے نگر پاکستان آ گئے' جہاں ان کا پہلا پڑاؤ کراچی میں تھا۔ کراچی میں مشاعروں کی روایت نے جالب کی شاعری کے شوق کو ہوا دی۔ اُس وقت تک وہ حبیب جالب نہیں صرف حبیب احمد تھا۔ جالب کو پتا تھا کہ شاعر ہونے کیلئے تخلص ہونا بھی ضروری ہے۔ تخلص کیلئے اسے "مست" کا لاحقہ اچھا لگا۔ یوں اب وہ مشاعروں میں حبیب احمد مست کے نام سے شرکت کرنے لگا مست کا تخلص اس کی شخصیت سے قریب تھا۔ کراچی کا قیام نو دس برس کا ہو گا یہیں جالب کی دوستی علاؤالدین سے ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب علاؤالدین صاحب پاکستانی فلموں میں اہم کردار ادا کرتے تھے۔ جالب سے علاؤالدین کی قریبی دوستی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کراچی سے لاہور آیا تو ابتدائی دنوں میں علاؤالدین کے گھر میں قیام کیا' اور پھر تو لاہور جالب کا دلبر شہر بن گیا۔ لاہور آ کر جلد ہی شعری حلقوں میں اس کی شناسائی ہو گئی تھی۔ اب ان کا قلمی نام حبیب جالب ہو گیا تھا۔ لاہور آ کر بھی اس کی پارہ صفت طبیعت کو چین نہیں تھا۔ تب ملکی سیاست نے ایک نیا موڑ لیا جب ملک میں ایوب خان کے مارشل لا کا آغاز ہوا۔ جالب کی آزاد پسند طبیعت کو یوں لگا جیسے یکلخت ہوا میں آکسیجن کم ہو گئی ہو۔ ملک میں ایک سناٹے کا عالم تھا۔ اگر کوئی آواز تھی تو ان درباریوں کی جو ستائش اور تعریف میں مصروف تھے۔ پھر 1962ء کا سال آ گیا' جب صدر ایوب کی حکومت کی طرف سے قوم کو ایک نیا آئین دیا گیا۔ اس پر درباری مدح خواہوں نے تعریفوں کے ڈونگرے برسانا شروع کر دیے جیسے یہ آئین قوم کے ہر دکھ اور درد کا مداوا بن کے آیا ہے۔ اس کے خلاف رائے دینے پر پابندی تھی۔ اس وقت صرف ایک توانا آواز جسٹس ایم آر کیانی کی تھی جو عدل کے ایوانوں میں گونج رہی تھی۔ جالب ایک دلِ حساس رکھتا تھا۔ یہ سناٹا اس کی جان کو آ رہا تھا۔ اسے اپنے جذبات کے اظہار کا موقع نہیں مل رہا تھا لیکن جلد ہی اس کا بندوبست بھی ہو گیا۔ اس زمانے میں مری میں ڈسٹرکٹ ایڈمنسٹریشن کے زیرِ اہتمام ایک عظیم الشان مشاعرہ ہوا کرتا تھا جس میں پاکستان بھر سے معروف شاعروں کو دعوت دی جاتی تھی۔ سامعین میں ایک بڑی تعداد سرکاری افسران کی ہوتی تھی۔ حبیب جالب باقی شاعروں کے

ہمراہ مشاعرے میں شرکت کیلئے ایک دن پہلے ہی مری پہنچ گئے تھے۔ رات کو مال روڈ پر گھومتے ہوئے انہیں ہائیکورٹ کے ایک جج مل گئے۔ وہ بھی ان کے ساتھ چہل قدمی کرنے لگے۔ باتوں باتوں میں جج صاحب نے جالب سے پوچھا کہ کل کے مشاعرے میں وہ کیا سنائیں گے۔ جالب نے بے ساختہ جواب دیا میں کل کے مشاعرے میں نظم "دستور" پڑھوں گا۔ یہ سُن کر جج صاحب نے انہیں مشورہ دیا کہ بہتر ہوگا آپ یہ نظم نہ پڑھیں کیونکہ اس کے نتائج خطرناک ہو سکتے ہیں۔

جالب نے سنی ان سنی کر دی۔ جج صاحب نے جالب کے خطرناک ارادوں کا تذکرہ مشاعرے کے منتظمین سے بھی کر دیا۔ یہ ایک سنجیدہ صورتحال تھی۔ مشاعرے کے منتظمین کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ حالات یہ رُخ اختیار کر جائیں گے۔ جالب کا شاعری میں ابتدائی تعارف ایک رومانوی شاعر کا تھا۔ ان کی پہلی کتاب "برگِ آوارہ" تھی۔ برگِ آوارہ ان کی رومانوی شاعری کا دور تھا لیکن حالات کی تلخی اب ان کی شاعری میں اُتر آئی تھی۔ انہوں نے خود سے عہد کیا تھا کہ مری کے مشاعرے میں اپنے دل کی بات ضرور کہے گا اور صدر ایوب کے دستور کی حقیقت سب کے سامنے کھول دے گا۔ ادھر مشاعرے کے منتظمین کو جالب کے ارادوں کی خبر ہو چکی تھی۔ انہوں نے ایک چال چلی' مشاعرے میں تین مقبول مزاحیہ شاعر شوکت تھانوی، سید محمد جعفری، اور ظریف جبلپوری بھی شریک تھے جن کے بارے میں مشہور تھا کہ اپنے کلام سے مشاعرہ لوٹ لیتے ہیں۔

منصوبے کے تحت حبیب جالب سے پہلے مزاحیہ شعرا کو بلایا گیا تا کہ اس کے بعد جالب کی ہوا اکھڑ جائے اور وہ اپنا کلام نہ سنا سکے۔ ان شعرا کو سامعین کُھل کر داد دے رہے تھے۔ لوگوں کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اسی شور و غُل میں حبیب جالب کا نام پکارا گیا۔ اب وہ گھڑی آن پہنچی تھی جس کا حبیب جالب کو عرصے سے انتظار تھا۔ جالب نے مائیک پر آ کر اپنی گمبھیر آواز میں کہا "خواتین وحضرات میری نظم کا عنوان ہے "دستور"۔ یہ سننا تھا کہ مشاعرہ کے منتظمین کے چہرے فق ہو گئے۔ ناظمِ مشاعرہ تیزی سے جالب کی طرف لپکا اور چیختے ہوئے کہا "کیا کر رہے ہو؟ کیا کر رہے ہو؟"۔

ضیاء الحق کے دور کا ایک اہم واقعہ ریفرنڈم تھا۔ یہ ریفرنڈم دراصل قوم کے ساتھ ایک بھونڈا مذاق تھا۔ عام لوگوں کی اکثریت نے اس ریفرنڈم کا بائیکاٹ کیا تھا لیکن نتیجہ تو پہلے سے ہی تیار ہو چکا تھا۔ یوں ریفرنڈم میں اسلامی اصلاحات کی حمایت میں 98.5 فیصد ووٹ آئے تھے جس کے نتیجے میں ضیاء الحق نے پانچ سال کے لیے اپنے اقتدار کی مدت میں اضافہ کر لیا۔ حبیب جالب نے ریفرنڈم کی اصلیت کا پول اپنی نظم ریفرنڈم میں یوں کھولا:

شہر میں ہُو کا عالم تھا جن تھا یا ریفرنڈم تھا
قید تھے دیواروں میں لوگ باہر شور بہت کم تھا
کچھ باریش سے چہرے تھے اور ایمان کا ماتم تھا
مرحومین شریک ہوئے سچائی کا چہلم تھا

ضیاء الحق کے دور میں بھٹو کو قتل کے جرم میں پھانسی دے دی گئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ دراصل عدالتی قتل تھا۔ اس وقت بھٹو کے دونوں بیٹے ملک سے باہر تھے ایسے میں بے نظیر بھٹو نے احتجاج کا پرچم اٹھایا۔ اس موقع پر جالب نے بے نظیر کیلئے نظم لکھی جو آناً فاناً گلیوں محلوں میں پھیل گئی۔ نظم کا آغاز اس طرح سے تھا:

ڈرتے ہیں بندوقوں والے ایک نہتی لڑکی سے
پھیلے ہیں ہمت کے اجالے ایک نہتی لڑکی سے

اس نظم نے بے نظیر کے لیے ملکی سطح پر ہمدردی کے جذبات پیدا کر دیے تھے لیکن پھر جب بے نظیر حکومت میں آ گئیں اور عوام کی کسمپرسی کا عالم وہی رہا تو جالب چپ نہ رہ سکا اور بول اٹھا:

وہی حالات ہیں فقیروں کے دن پھرے ہیں تو بس وزیروں کے
ہر بلاول ہے دیس کا مقروض پاؤں ننگے ہیں بے نظیروں کے

اب جالب کا دمِ آخریں قریب آ رہا تھا۔ پاکستانی سیاست میں مزاحمت کا سب سے روشن چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ وہ جس کی شاعری نے کتنے ہی دلوں کو ولولۂ تازہ دیا تھا' وہ جس کی جمہوریت کے لیے قربانیاں ہمیشہ یاد رہیں گی' وہ جس نے گھر کی آسائش کی بجائے عام لوگوں کے مفادات کے لیے جدوجہد پر توجہ دی۔ جالب کو کیا پتہ تھا کہ اس کے بعد بھی اس کی شاعری کی تپش لوگوں کے دلوں کو گرماتی رہے گی اور مزاحمت کے قافلوں کی پیشوائی کرتی رہے گی۔

جب پرویز مشرف کے زمانے میں ججوں کو گھر بھیج دیا گیا تو عدلیہ بحالی تحریک چلی اس تحریک کا حصہ بننے کے لیے حبیب جالب موجود نہیں تھے کیونکہ اس سے پہلے ان کا انتقال ہو چکا تھا' لیکن ان کا کلام اس تحریک کا ترانہ بن گیا۔ ریلیاں شروع ہو گئیں جن میں وکیلوں کے علاوہ سول سوسائٹی کے لوگ بھی شریک ہوتے۔ لندن میں احتجاجی ریلیوں میں شاہرام اور تیمور (لال بینڈ) جالب کے کلام سے دلوں کو گرماتے تھے۔ احتجاجی ریلیوں میں شاہرام کی دل نشیں آواز میں "دستور"، "مشیر" اور جالب کی دوسری نظموں نے ایک سماں باندھ دیا تھا۔ عدلیہ بحالی تحریک کامیاب ہوگئی' تحریک کی کامیابی میں دوسرے عوامل کے علاوہ جالب کی انقلابی نظموں کا بھی حصہ تھا۔ یہ ہے زندہ کلام کی تاثیر جو کبھی پرانا نہیں ہوتا' جو ہر دور میں مظلوموں' محنت کشوں اور مفلسوں کی دل کی آواز بن جاتا ہے۔ اس کلام میں جالب کی ذاتی جدوجہد کی روشنی بھی شامل تھی۔ جالب ہر دور میں جابر حکمرانوں کی آنکھوں میں کھٹکتا رہا لیکن وہ معاشرے کے پسے ہوئے طبقے کی ترجمانی پوری ایمانداری سے کرتا رہا۔ جس نے قوم کے لیے اپنے گھر اور پیاروں کو فراموش کر دیا' جس کی موت کے بعد اس کے گھر والے شدید معاشی مشکلات کا شکار ہو گئے۔ جس کی بیٹی طاہرہ ٹیکسی چلاتی ہے لیکن شاید ہر بااصول شخص کا مقدر یہی ہوتا ہے۔ حبیب جالب کی کہانی نئی نہیں۔ ازل سے ابد تک انسانی تاریخ کی یہی داستان ہے۔ وہی جبر کی سیاہ رات' وہی تعزیر کی تیز ہوائیں اور وہی ان ہواؤں سے الجھتے مزاحمت کے چراغ۔ جالب بھی ایک ایسا ہی چراغ تھا جو عمر بھر منہ زور حکمرانوں سے الجھتا رہا۔ جو آمریت کی سیاہ رات میں امید کی روشن کرن تھا اور جس کی روشنی

جبر کی راتوں میں امید کی راہیں اجالتی رہے گی۔ اب جالب کی صحت ایک گرتی ہوئی دیوار تھی اسے لاہور کے شیخ زید ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔ نقاہت نے جالب کو بستر سے لگا دیا تھا لیکن اس عالم میں بھی وہ ذہنی طور پر چوکس اور مستعد تھا معروف صحافی مجاہد بریلوی راوی ہیں کہ جب جالب ہسپتال میں تھے تو نواز شریف کی حکومت تھی انہی دنوں نواز شریف نے ایک جلسے میں عوام کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں آپ کے لیے جان بھی دے دوں گا‘ جالب نے بستر پر لیٹے لیٹے ایک نظم لکھی جس کا مطلع تھا

نہ جاں دے دو نہ دل دے دو
بس اپنی ایک مل دے دو

ہسپتال کی طویل راتوں میں جب جالب تنہا ہوتا تو اسے ان سب ہم سفروں کا خیال آتا جنہوں نے جمہوریت کے لیے اپنی زندگیوں کو داؤ پر لگا دیا تھا۔ پھر اسے اپنی زندگی کے وہ سارے مرحلے یاد آ جاتے جب ایک جنون اس کی زندگی کا زادِ راہ تھا اور جب وہ جمہوریت کی نیلم پری کے تعاقب میں بہت دور نکل گیا تھا۔ پھر اسے اپنی نظم ”جمہوریت نہ آئی“ کا ایک بند یاد آ گیا اور اس کے چہرے پر ملال کا رنگ چھا گیا۔ نظم کی سطر سطر میں اداسی جھلک رہی تھی: بنگال بھی گنوایا / اپنا ہی خوں بہایا / دار و رسن سے کھیلے / پاپڑ ہزار بیلے / محنت نہ رنگ لائی / جاں رات دن کھپائی / جمہوریت نہ آئی تب رات کے گھپ اندھیرے میں اسے ایک بہت پرانی بات یاد آ گئی اور اس کے چہرے پر خود بخود مسکراہٹ پھیل گئی۔ اسے وہ دن یاد آ گیا جب پولیس اسے ہتھکڑیاں لگا کر اس کے گھر لائی تھی تا کہ وہ اپنی ضبط شدہ کتاب برآمد کرائے۔ ایسے میں اس کی ننھی سی معصوم بیٹی باپ کے ہاتھوں میں ہتھکڑی دیکھ کر ہنس پڑی تھی۔ شاید وہ ہتھکڑی کو کھلونا سمجھی تھی۔ جالب کو اس موقع پر لکھی ہوئی اپنی نظم یاد آ گئی

اس کو شاید کھلونا لگی ہتھکڑی
میری بچی مجھے دیکھ کر ہنس پڑی
یہ ہنسی تھی سحر کی بشارت مجھے
یہ ہنسی دے گئی کتنی طاقت مجھے
کس قدر زندگی کو سہارا ملا
ایک تابندہ کل کا اشارہ ملا

ہسپتال کے بستر پر لیٹے لیٹے جالب کی نظروں کے سامنے سے ماضی کے سارے منظر گزر گئے۔ اس نے سوچا کیسا کٹھن راستہ تھا لیکن کیسا دلربا سفر تھا جب وہ ایک خواب کی انگلی پکڑ کر چل رہا تھا۔ اسے اپنا ایک شعر یاد آ گیا جو زندگی کے سفر میں اس کا منشور رہا۔

نہ ڈگمگائے کبھی ہم وفا کے رستے میں
چراغ ہم نے جلائے وفا کے رستے میں

اس کے چہرے پر اطمینان اور تشکر کی روشنی پھیل گئی۔ پھر اس کی آنکھیں خود بخود مندنے لگیں۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی چاندنی اترنے لگی اور ایک نئی سحر کی بشارت اس کی بند ہوتی ہوئی آنکھوں میں ہلکورے لینے لگی۔ ❁❁❁

امتحان میں پاس ہونے کی سفارش

احمد ندیم قاسمی کی ایک عزیزہ نے اردو ایم اے کا امتحان دیا تو پتا چلا کہ اس کے پرچے صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے پاس چیک کرنے کے لیے بھیجے گئے ہیں۔ قاسمی صاحب سفارش کے لیے اس عزیزہ کو ساتھ لے کر صوفی صاحب کے گھر پہنچے۔ صوفی صاحب دعا سلام کے بعد فوراً ہی اٹھ کر کمرے کے اندر چلے گئے، جب وہ کافی دیر تک باہر تشریف نہ لائے، تو قاسمی صاحب کو صوفی صاحب کے برتاؤ پر بہت افسوس ہوا کہ چائے پوچھی نہ آنے کا مقصد سُنا اور اٹھ کر چلے گئے۔ اتنے میں صوفی صاحب ایک پرچہ ہاتھ میں لیے باہر آئے اور اسے قاسمی کو دیتے ہوئے پوچھا کہ فرمائیے، اس میں کتنے نمبر دے دوں؟ قاسمی صاحب اس پر بہت حیران ہوئے اور پوچھا کہ آپ کو کیسے پتا چلا کہ میں اس کام کے سلسلے میں آیا ہوں۔ اس پر صوفی صاحب بولے ”بھئی کل ۳۲ پرچے میرے پاس آئے تھے، اور ۳۱ اصحاب اس سے پہلے میرے پاس سفارش کے لیے آ چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ آپ اس آخری پرچے کے سلسلے میں آئے ہوں گے۔

نقل و ترسیل

❁❁❁

ہاسٹل میں پڑھنا

تحریر: پطرس بخاری

ہم نے کالج میں تعلیم تو ضرور پائی اور رفتہ رفتہ بی اے بھی پاس کر لیا، لیکن اس نصف صدی کے دوران میں جو کالج میں گزارنی پڑی۔ ہاسٹل میں داخل ہونے کی اجازت ہمیں صرف ایک ہی دفعہ ملی۔

خدا کا یہ فضل ہم پر کب اور کس طرح ہوا؟ یہ سوال ایک داستان کا محتاج ہے۔ جب ہم نے انٹرنس پاس کیا تو مقامی اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب خاص طور پر مبارکباد دینے کے لیے آئے قریبی رشتہ داروں نے دعوتیں دیں۔ محلے والوں میں مٹھائی بانٹی گئی اور ہمارے گھر والوں پر یک لخت اس بات کا انکشاف ہوا کہ وہ لڑکا جسے آج تک اپنی کوتاہ بینی کی وجہ سے ایک بے کار اور نالائق فرزند سمجھتے رہے تھے دراصل لامحدود قابلیتوں کا مالک ہے۔ جس کی نشوونما پر بے شمار آنے والی نسلوں کی بہبودی کا انحصار ہے۔

چنانچہ ہماری آئندہ زندگی کے متعلق طرح طرح کی تجویزوں پر غور کیا جانے لگا۔ تھرڈ ڈویژن میں پاس ہونے کی وجہ سے یونیورسٹی نے ہم کو وظیفہ دینا مناسب نہ سمجھا۔ چونکہ ہمارے خاندان نے خدا کے فضل سے آج تک کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا اس لیے وظیفے کا نہ ملنا خصوصاً ان رشتہ داروں کے لیے جو رشتے کے لحاظ سے خاندان کے مضافات میں بستے تھے، فخر و مباہات کا باعث بن گیا۔ اور "مرکزی رشتے داروں" نے تو اس کو پاس وضع اور حفظ مراتب سمجھ کر ممتحنوں کی شرافت و نجابت کو بے انتہا سراہا۔ بہر حال ہمارے خاندان میں فالتو روپے کی بہتات تھی۔ اس لیے بلا تکلف یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ نہ صرف ہماری بلکہ ملک و قوم اور شاید بنی نوع انسان کی بہتری کے لیے یہ ضروری ہے کہ ایسے ہونہار طالب علم کی تعلیم جاری رکھی جائے۔

اس بارے میں ہم سے بھی مشورہ کیا گیا۔ عمر بھر میں اس سے پہلے ہمارے کسی معاملے میں ہم سے رائے طلب نہ کی گئی تھی لیکن اب تو حالات بہت مختلف تھے۔ اب تو ایک غیر جانبدار اور ایماندار مصنف یعنی یونیورسٹی ہماری بیدار مغزی کی تصدیق کر چکی تھی۔ اب بھلا ہمیں کیونکہ نظرانداز کیا جاسکتا تھا۔ ہمارا مشورہ یہ تھا کہ ہمیں فوراً ولایت بھیج دیا جائے۔ ہم نے مختلف لیڈروں کی تقریروں سے یہ ثابت کیا کہ ہندوستان کا طریقہ تعلیم بہت ناقص ہے۔ اخبارات میں سے اشتہار دکھا دکھا کر یہ واضح کیا کہ ولایت میں کالج کی تعلیم کے ساتھ ساتھ فرصت کے اوقات میں بہت تھوڑی تھوڑی فیسیں دے کر بیک وقت جرنلزم، فوٹو گرافی، تصنیف و تالیف، دندان سازی، عینک سازی، ایجنٹوں کا کام غرض یہ کہ بے شمار مفید اور کم خرچ بالانشیں پیشے سیکھے جا سکتے ہیں۔ اور تھوڑے عرصے کے اندر انسان ہر فن مولا بن سکتا ہے۔

لیکن ہماری تجویز کو فوراً رد کر دیا گیا۔ کیونکہ ولایت بھیجنے کے لیے ہمارے شہر میں کوئی روایات موجود نہ تھیں۔ ہمارے گرد و نواح میں کسی کا لڑکا ابھی تک ولایت نہ گیا تھا اس لئے ہمارے شہر کی پبلک وہاں کے حالات سے قطعاً ناواقف تھی۔

اس کے بعد پھر ہم سے رائے طلب نہ کی گئی اور ہمارے والد، ہیڈ ماسٹر صاحب اور تحصیلدار صاحب ان تینوں نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ ہمیں لاہور بھیج دیا جائے۔

جب ہم نے یہ خبر سنی تو شروع شروع میں ہمیں سخت مایوسی ہوئی۔ لیکن جب ادھر اُدھر کے لوگوں سے لاہور کے حالات سنے تو معلوم ہوا کہ لندن اور لاہور میں چنداں فرق نہیں بعض واقف کار دوستوں نے سینما کے حالات پر روشنی ڈالی بعض نے تھیٹروں کے مقاصد سے آگاہ کیا۔ بعض نے ٹھنڈی سڑک وغیرہ کے مشاغل کو سلجھا کر سمجھایا۔ بعض نے شاہدرے اور شالامار کی ارمان انگیز فضا کا نقشہ کھینچا۔ چنانچہ جب لاہور کا جغرافیہ پوری طرح ہمارے ذہن نشین ہو گیا تو ثابت یہ ہوا کہ خوشگوار مقام ہے۔ اور اعلیٰ درجے کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے بے حد موزوں۔ اس پر ہم نے اپنی زندگی کا پروگرام وضع کرنا شروع کر دیا جس میں لکھنے پڑھنے کو جگہ تو ضرور دی گئی، لیکن ایک مناسب حد تک، تاکہ طبیعت پر کوئی ناجائز بوجھ نہ پڑے۔ اور فطرت اپنا کام حسن و خوبی کے ساتھ کر سکے۔

لیکن تحصیلدار صاحب اور ہیڈ ماسٹر صاحب کی نیک نیتی یہیں تک محدود نہ رہی۔ اگر وہ ایک عام اور مجمل سا مشورہ دے دیتے کہ لڑکے کو لاہور بھیج دیا جائے تو بہت خوب تھا۔ لیکن انہوں نے تو تفصیلات میں دخل دینا شروع کر دیا۔ اور ہاسٹل کی زندگی اور گھر کی زندگی کا مقابلہ کر کے ہمارے والد پر یہ ثابت کر دیا کہ گھر پاکیزگی اور طہارت کا ایک کعبہ اور ہاسٹل گناہ و معصیت کا ایک دوزخ ہے۔ ایک تو تھے وہ چرب زبان، اس پر انہوں نے بے شمار غلط بیانیوں سے کام لیا۔ چنانچہ گھر والوں کو یقین سا ہو گیا کہ کالج کا ہاسٹل جرائم پیشہ اقوام کی ایک بستی ہے۔ اور جو طلباء باہر کے شہروں سے لاہور جاتے ہیں اگر ان کی پوری طرح نگہداشت نہ کی جائے تو وہ اکثر یا تو شراب کے نشے میں چور سڑک کے کنارے کسی نالی میں گرے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ یا کسی جوئے خانہ میں ہزار ہا روپے ہار کر خودکشی کر لیتے ہیں یا پھر فرسٹ ایئر کا امتحان پاس کرنے

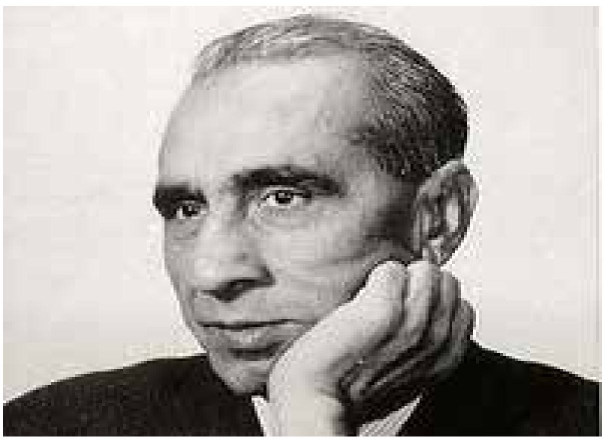

سے پہلے دس بارہ شادیاں کر بیٹھے ہیں۔

چنانچہ گھر والوں کو یہ سوچنے کی عادت پڑ گئی کہ لڑکے کو کالج میں تو داخل کیا جائے لیکن ہاسٹل میں نہ رکھا جائے۔ کالج ضرور مگر ہاسٹل ہرگز نہیں۔ کالج مفید۔ مگر ہاسٹل مضر۔ وہ بہت ٹھیک مگر یہ ناممکن۔ جب انہوں نے اپنی زندگی کا نصب العین ہی یہ بنالیا کہ کوئی ایسی ترکیب سوچی جائے جس سے لڑکا ہاسٹل کی زد سے محفوظ رہے تو کسی ترکیب کا سوجھ جانا کیا مشکل تھا ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ چنانچہ ازحد غور و خوض کے بعد لاہور میں ہمارے ایک ماموں دریافت کئے گئے۔ اور ان کو ہمارا سرپرست بنادیا گیا۔ میرے دل میں ان کی عزت پیدا کرنے کے لیے بہت سے شجروں کی ورق گردانی سے مجھ پر یہ ثابت کیا کہ وہ واقعی میرے ماموں ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ جب میں ایک شیر خوار بچہ تھا تو وہ مجھ سے بے انتہا محبت کیا کرتے تھے۔ چنانچہ فیصلہ یہ ہوا کہ ہم پڑھیں کالج میں رہیں ماموں کے گھر۔ اس سے تحصیل علم کا جو ایک ولولہ سا ہمارے دل میں اُٹھ رہا تھا وہ کچھ بیٹھ سا گیا۔ ہم نے سوچا یہ ماموں لوگ اپنی سرپرستی کے زعم میں والدین سے بھی زیادہ احتیاط برتیں گے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارے دماغی اور روحانی قویٰ کو پھلنے پھولنے کا موقع نہ ملے گا۔ اور تعلیم کا اصلی مقصد فوت ہوجائے گا۔ چنانچہ وہی ہوا جس کا ہمیں خوف تھا۔ ہم روز بروز مرجھاتے چلے گئے۔ اور ہمارے دماغ پر پھپھوندی سی جمنے لگی۔ سینما جانے کی اجازت کبھی کبھار مل جاتی تھی لیکن اس شرط پر کہ بچوں کو بھی ساتھ لیتا جاؤں۔ اس صحبت میں، میں بھلا سینما سے کیا اخذ کرسکتا تھا۔ تھیٹر کے معاملے میں ہماری معلومات اندرسبھا سے آگے بڑھنے نہ پائیں۔ تیرنا ہمیں نہ آیا کیونکہ ہمارے ماموں کا ایک مشہور قول ہے کہ ڈوبتا وہی ہے جو تیراک ہو جسے تیرنا نہ آتا ہو وہ پانی میں گھستا ہی نہیں۔ گھر پر آنے جانے والے دوستوں کا انتخاب ماموں کے ہاتھ میں تھا۔ کوٹ کتنا لمبا پہنا جائے، اور بال کتنے لمبے رکھے جائیں۔ ان کے متعلق ہدایات بہت کڑی تھیں۔ ہفتے میں دوبار گھر خط لکھنا ضروری تھا۔ سگریٹ غسل خانے میں چھپ کر پیتے تھے۔ گانے بجانے کی سخت ممانعت تھی۔

یہ سپاہیانہ زندگی ہمیں راس نہ آئی۔ یوں تو دوستوں سے ملاقات بھی ہوجاتی تھی۔ سیر کو بھی چلے جاتے تھے۔ ہنس بول بھی لیتے تھے لیکن وہ جو زندگی میں ایک آزادی ایک فراخی، ایک وارفتگی ہونی چاہئے وہ ہمیں نصیب نہ ہوئی۔ رفتہ رفتہ ہم اپنے ماحول پر غور کرنا شروع کیا کہ ماموں جان عموماً کس وقت گھر میں ہوتے ہیں، کس وقت باہر جاتے ہیں، کس کمرے سے کس کمرے تک گانے کی آواز نہیں پہنچ سکتی، کس دروازے سے کمرے کے کس کونے میں جھانکنا ممکن ہے۔ گھر کا کون سا دروازہ رات کے وقت باہر سے کھولا جاسکتا ہے، کون سا ملازم موافق ہے، کون سا نمک حلال ہے۔ جب تجربے اور مطالعے سے ان باتوں کا اچھی طرح اندازہ ہوگیا تو ہم نے اس زندگی میں بھی نشوونما کے لیے چند گنجائشیں پیدا کرلیں۔ لیکن پھر بھی ہم روز دیکھتے تھے کہ ہاسٹل میں رہنے والے طلباء کس طرح اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر زندگی کی شاہراہ پر چل رہے ہیں۔ ہم ان کی زندگی پر رشک کرنے لگے۔ اپنی زندگی کو سدھارنے کی خواہش ہمارے دل میں روز بروز بڑھتی گئی۔ ہم نے دل سے کہا والدین کی نافرمانی کسی مذہب میں جائز نہیں۔ لیکن ان کی خدمت میں درخواست کرنا ان کے سامنے اپنی ناقص رائے کا اظہار کرنا ان کو صحیح واقعات سے آگاہ کرنا میرا فرض ہے۔ اور دنیا کی کوئی طاقت مجھے اپنے فرض کی ادائیگی سے باز نہیں رکھ سکتی۔

چنانچہ جب گرمیوں کی تعطیلات میں، میں وطن کو واپس گیا تو چند مختصر مگر جامع اور مؤثر تقریریں اپنے دماغ میں تیار رکھیں۔ گھر والوں کو ہاسٹل پر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ وہاں کی آزادی نوجوانوں کے لیے ازحد مضر ہوتی ہے۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے ہزار ہا واقعات ایسے تصنیف کئے جن سے ہاسٹل کے قواعد کی سختی ان پر اچھی طرح روشن ہو جائے۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب کے ظلم و تشدد کی چند مثالیں رقت انگیز اور ہیبت خیز پیرائے میں سنائیں۔ آنکھیں بند کر کے ایک آہ بھری اور بیچارے اشفاق کا واقعہ بیان کیا کہ ایک دن شام کے وقت بیچارا ہاسٹل کو واپس آرہا تھا۔ چلتے چلتے پاؤں میں موچ آگئی۔ دو منٹ دیر سے پہنچا صرف دو منٹ۔ بس صاحب اس پر سپرنٹنڈنٹ صاحب نے فوراً تار دے کر اس کے والد کو بلوایا۔ پولیس سے تحقیقات کرنے کو کہا۔ اور مہینے بھر کے لیے اس کا جیب خرچ بند کروادیا۔ توبہ ہے الٰہی! لیکن یہ واقعہ سن کر گھر کے لوگ سپرنٹنڈنٹ صاحب کے مخالف ہوگئے۔ ہاسٹل کی خوبی ان پر واضح نہ ہوئی۔ پھر ایک دن موقع پا کر بیچارے محمود کا واقعہ بیان کیا کہ ایک دفعہ شامت اعمال بیچارا سینما دیکھنے چلا گیا۔ قصور اس سے یہ ہوا کہ ایک روپے والے درجے میں جانے کی بجائے دو روپے والے درجے میں چلا گیا۔ بس اتنی سی فضول خرچی پر اسے عمر بھر کو سینما جانے کی ممانعت ہوگئی ہے۔

لیکن اس سے بھی گھر والے متاثر نہ ہوئے۔ ان کے رویے سے مجھے فوراً احساس ہوا کہ ایک روپے اور دو روپے کی بجائے آٹھ آنے اور ایک روپیہ کہنا چاہئے تھا۔ ان ہی ناکام کوششوں میں تعطیلات گزر گئیں اور ہم نے پھر ماموں کی چوکھٹ پر آکر سجدہ کیا۔

اگلی گرمیوں میں جب ہم پھر گھر گئے تو ہم نے ایک نیا ڈھنگ اختیار کیا۔ دو سال تعلیم پانے کے بعد ہمارے خیالات میں پختگی سی آگئی تھی پچھلے سال ہاسٹل کی حمایت میں جو دلائل ہم نے پیش کی تھیں، وہ اب ہمیں نہایت بودی معلوم ہونے لگی تھیں۔ اب کے ہم نے اس موضوع پر ایک لیکچر دیا کہ جو شخص ہاسٹل کی زندگی سے محروم ہو اس کی شخصیت نامکمل رہ جاتی ہے۔ ہاسٹل سے باہر شخصیت پنپنے نہیں پاتی۔ چند دن تو ہم اس پر فلسفیانہ گفتگو کرتے رہے۔ اور نفسیات کے نقطہ نظر سے اس پر بہت کچھ روشنی ڈالی۔ لیکن ہمیں محسوس ہوا کہ بغیر مثالوں کے کام نہ چلے گا۔ اور جب مثالیں دینے کی نوبت آئی، تو ذرا وقت محسوس ہوئی۔ کالج کے جن طلباء کے متعلق میرا ایمان تھا کہ وہ زبردست شخصیتوں کے مالک ہیں، ان کی زندگی کچھ ایسی نہ تھی کہ والدین کے سامنے بطور نمونے کے پیش کی جاسکے۔ ہر وہ شخص جسے کالج میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا ہے، جانتا ہے کہ ''والدینی اغراض'' کے لیے واقعات کو ایک نئے اور اچھوتے پیرائے میں بیان کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے لیکن اس پیرائے کا سوجھ جانا الہام اور اتفاق پر منحصر ہے۔ بعض روشن خیال بیٹے اپنے والدین کو اپنے حیرت انگیز اوصاف کا قائل نہیں کرسکتے اور بعض نالائق سے نالائق طالب علم والدین کو

کچھ اس طرح مطمئن کر دیتے ہیں کہ ہر ہفتے ان کے نام منی آرڈر چلا آتا ہے۔

بنادان آں چناں روزی رساند کہ دانا اندراں حیراں بماند

جب ہم ڈیڑھ مہینے تک شخصیت اور ہاسٹل کی زندگی پر اس کا انحصار، ان پر مضمونوں پر وقتاً فوقتاً اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے تو ایک والد نے پوچھا:

تمہارا شخصیت سے آخر مطلب کیا ہے؟

میں تو خدا سے یہی چاہتا تھا کہ وہ مجھے عرض و معروض کا موقع دیں۔ میں نے کہا۔ ''دیکھئے نا۔ مثلاً ایک طالب علم ہے، وہ کالج میں پڑھتا ہے۔ اب ایک تو اس کا دماغ ہے دوسرا اس کا جسم ہے۔ جسم کی صحت بھی ضروری ہے۔ اور دماغ کی صحت تو ضروری ہے ہی۔ لیکن ان کے علاوہ ایک اور بات بھی ہوتی ہے جس سے آدمی کو پہچانا جاتا ہے۔ میں اس کو شخصیت کہتا ہوں۔ اس کا تعلق نہ جسم سے ہوتا ہے نہ دماغ سے، ہوسکتا ہے کہ ایک آدمی کی جسمانی صحت بالکل خراب ہو اور اس کا دماغ بھی بالکل بیکار ہو، لیکن پھر بھی اس کی شخصیت۔۔۔ نہ خیر دماغ تو بیکار نہیں ہونا چاہئے ورنہ انسان خبطی ہوتا ہے لیکن پھر بھی اگر ہو بھی۔ تو بھی۔۔۔

گویا شخصیت ایک ایسی چیز ہے۔۔۔ ٹھہریئے، میں ابھی ایک منٹ میں آپ کو بتاتا ہوں۔

ایک منٹ کی بجائے والد نے مجھے آدھ گھنٹے کی مہلت دی جس کے دوران میں وہ خاموشی کے ساتھ میرے جواب کا انتظار کرتے رہے، اس کے بعد وہاں سے اُٹھ کر چلا آیا۔

تین چار دن کے بعد مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا، مجھے شخصیت نہیں سیرت کہنا چاہئے۔ شخصیت ایک بے رنگ سا لفظ ہے۔ سیرت کے لفظ سے نیکی ٹپکتی ہے۔ چنانچہ میں نے سیرت کو اپنا تکیہ کلام بنالیا۔ لیکن یہ بھی مفید ثابت نہ ہوا۔ والد کہنے لگے۔ ''کیا سیرت سے تمہارا مطلب چال چلن ہے یا کچھ اور؟'' میں نے کہا ''چال چلن کہہ لیجئے۔''

''تو گویا دماغی اور جسمانی صحت کے علاوہ چال چلن بھی اچھا ہونا چاہئے۔''

میں نے کہا۔ ''بس یہی تو میرا مطلب ہے۔''

''اور یہ چال چلن ہاسٹل میں رہنے سے بہت اچھا ہو جاتا ہے!''

میں نسبتاً نحیف آواز سے کہا۔ ''جی ہاں۔''

''یعنی ہاسٹل میں رہنے والے طالب علم نماز، روزے کے زیادہ پابند ہوتے ہیں، ملک کی زیادہ خدمت کرتے ہیں، سچ زیادہ بولتے ہیں، نیک زیادہ ہوتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''جی ہاں''۔

کہنے لگے۔ ''وہ کیوں؟''

اس سوال کا جواب ایک دفعہ پرنسپل صاحب نے تقسیم انعامات کے جلسے میں نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا تھا، اے کاش میں نے اس وقت توجہ سے سنا ہوتا!

اس کے بعد پھر سال بھر میں ماموں کے گھر میں ''زندگی ہے تو خزاں کے بھی گزر جائیں گے دن۔'' گاتا رہا۔

ہر سال میری درخواست کا یہی حشر ہوتا رہا لیکن میں نے ہمت نہ ہاری۔ ہر سال ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ لیکن اگلے سال گرمی کی چھٹیوں میں پہلے سے بھی زیادہ شد و مد کے ساتھ تبلیغ کا کام جاری رکھتا۔ ہر دفعہ نئی دلیلیں پیش کرتا، نئی نئی مثالیں کام میں لاتا۔ جب شخصیت اور سیرت والے مضمون سے کام نہ چلا تو اگلے سال ہاسٹل کی زندگی کے انضباط اور باقاعدگی پر تبصرہ کیا۔ اس سے اگلے سال یہ دلیل پیش کی کہ ہاسٹل میں رہنے سے پروفیسروں کے ساتھ ملنے جلنے کے موقعے زیادہ ملتے رہتے ہیں۔ اور ان ''بیرون از کالج'' ملاقاتوں سے انسان پارس ہو جاتا ہے۔ اس سے اگلے سال یہ مطلب یوں ادا کیا کہ ہاسٹل کی آب و ہوا بڑی اچھی ہوتی ہے۔ صفائی کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے۔ مکھیاں اور مچھر مارنے کے لیے کئی افسر مقرر ہیں۔ اس سے اگلے سال یوں سخن پیرا ہوا کہ جب بڑے بڑے حکام کالج کا معائنہ کرتے آتے ہیں تو ہاسٹل میں رہنے والے طلباء سے فرداً فرداً ہاتھ ملاتے ہیں، اس سے رسوخ بڑھتا ہے لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، میری تقریروں میں جوش بڑھتا گیا، معقولیت کم ہوتی گئی۔ شروع شروع میں ہاسٹل کے مسئلے پر والد مجھ سے باقاعدہ بحث کیا کرتے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد انہوں نے یک لفظی انکار کا رویہ اختیار کیا۔ پھر ایک آدھ سال مجھے ہنس کے ٹالتے رہے۔ اور آخر میں یہ نوبت آن پہنچی کہ وہ ہاسٹل کا نام سنتے ہی طنز آمیز قہقہے کے ساتھ مجھے تشریف لے جانے کا حکم دے دیا کرتے تھے۔

ان کے اس سلوک سے آپ یہ اندازہ نہ لگایئے کہ ان کی شفقت کچھ کم ہوگئی تھی، ہرگز نہیں حقیقت صرف اتنی ہے کہ بعض ناگوار حادثات کی وجہ سے گھر میں میرا اقتدار کچھ کم ہو گیا تھا۔ اتفاق یہ ہوا کہ میں نے جب پہلی مرتبہ بی۔ اے کا امتحان دیا، تو فیل ہو گیا۔ اگلے سال ایک مرتبہ پھر یہی واقعہ پیش آیا۔ اس کے بعد بھی جب تین چار دفعہ یہی قصہ ہوا تو گھر والوں نے میری امنگوں میں دلچسپی لینی چھوڑ دی۔ بی۔ اے میں پے در پے فیل ہونے کی وجہ سے میری گفتگو میں ایک سوز تو ضرور آ گیا تھا، لیکن کلام میں وہ پہلے جیسی شوکت اور میری رائے وہ پہلی جیسی وقعت اب نہ رہی تھی۔

میں زمانہ طالب علمی کے اس دور کا حال ذرا تفصیل سے بیان کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ اس سے ایک تو آپ میری زندگی کے نشیب و فراز سے اچھی طرح واقف ہو جائیں گے اور اس کے علاوہ اس سے یونیورسٹی کی بعض بے قاعدگیوں کا راز بھی آپ پر آشکار ہو جائے گا۔

میں پہلے سال بی۔ اے میں کیوں فیل ہوا؟ اس کا سمجھنا بہت آسان ہے۔ بات یہ ہوئی کہ جب ہم نے ایف۔ اے کا امتحان دیا تو چونکہ ہم نے کام خوب دل لگا کر کیا تھا، اس لیے ہم اس میں ''کچھ'' پاس ہی ہوگئے۔ بہر حال فیل نہ ہوئے، یونیورسٹی نے یوں تو ہمارا ذکر بڑے اچھے الفاظ میں کیا لیکن ریاضی کے متعلق یہ ارشاد ہوا کہ صرف اس مضمون کا امتحان ایک آدھ دفعہ پھر دے ڈالو۔ (ایسے امتحان کو اصطلاحاً کمپارٹمنٹ کا امتحان کہا جاتا ہے۔ شاید اس لیے کہ بغیر رضامندی اپنے ہمراہی مسافروں کے اگر کوئی اس میں سفر کر رہے ہوں، نقل نویسی کی سخت ممانعت ہے۔)

اب جب ہم بی۔ اے میں داخل ہونے لگے تو ہم نے یہ سوچا کہ بی۔ اے میں ریاضی لیں گے۔ اس طرح سے کمپارٹمنٹ کے امتحان کے لیے فالتو کام نہ کرنا پڑے گا۔ لیکن ہمیں سب لوگوں نے یہ مشورہ دیا کہ تم ریاضی مت لو۔ جب ہم نے اس کی وجہ پوچھی تو

کسی نے ہمیں کوئی معقول جواب نہ دیا لیکن جب پرنسپل صاحب نے بھی مشورہ دیا تو ہم رضامند ہوگئے۔ چنانچہ بی۔اے میں ہمارے مضامین انگریزی، تاریخ اور فارسی قرار پائے۔ساتھ ساتھ ہم ریاضی کے امتحان کی بھی تیاری کرتے رہے۔گویا ہم تین کی بجائے چار مضمون پڑھ رہے تھے۔اس طرح سے جو صورت حال پیدا ہوئی اس کا اندازہ وہی لوگ لگاسکتے ہیں جنہیں یونیورسٹی کے امتحانات کا کافی تجربہ ہے۔ہماری قوت مطالعہ منتشر ہو گئی اور خیالات میں پراگندگی پیدا ہوئی۔اگر مجھے چار کی بجائے صرف تین مضامین پڑھنے ہوتے تو جو وقت میں فی الحال چوتھے مضمون کو دے رہا تھا۔وہ بانٹ کر ان تین مضامین کو دیتا۔آپ یقین مانئے اس سے بڑا فرق پڑجاتا اور فرض کیا اگر میں وہ وقت تینوں کو بانٹ کر نہ دیتا بلکہ سب کا سب ان تینوں میں سے کسی ایک مضمون کے لیے وقف کر دیتا تو کم از کم اس مضمون میں تو ضرور پاس ہوجاتا۔لیکن موجودہ حالات میں تو وہی ہونا لازم تھا جو ہوا یعنی یہ کہ میں کسی مضمون پر بھی کماحقہٗ توجہ نہ کرسکا۔کمپارٹمنٹ کے امتحان میں تو پاس ہوگیا لیکن بی۔اے میں ایک تو انگریزی میں فیل ہوا۔وہ تو ہونا ہی تھا کیونکہ انگریزی ہماری مادری زبان نہیں۔اس کے علاوہ تاریخ اور فارسی میں بھی فیل ہوگیا۔اب آپ ہی سوچئے ناکہ جو وقت مجھے کمپارٹمنٹ کے امتحان پر صرف کرنا پڑا وہ اگر میں وہاں صرف نہ کرتا بلکہ اس کے بجائے۔۔۔مگر خیر یہ بات میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔

فارسی میں کسی ایسے شخص کا فیل ہونا جو ایک علم دوست خاندان سے تعلق رکھتا ہو لوگوں کے لیے ازحد حیرت کا موجب ہوا۔اور سچ پوچھئے تو ہمیں بھی اس پر سخت ندامت ہوئی۔لیکن خیر اگلے سال یہ ندامت دھل گئی۔اور ہم فارسی میں پاس ہوگئے اور اس سے اگلے سال تاریخ میں پاس ہوگئے اور اس سے اگلے سال انگریزی میں۔

اب قاعدے کی رو سے ہمیں بی۔اے کا سرٹیفکیٹ مل جانا چاہئے تھا۔لیکن یونیورسٹی کی اس طفلانہ ضد کا کیا علاج کہ تینوں مضمونوں میں بیک وقت پاس ہونا ضروری ہے۔بعض طبائع ایسی ہیں کہ جب تک یکسوئی نہ ہو، مطالعہ نہیں کرسکتے۔کیا ضروری ہے کہ ان کے دماغ کو زبردستی ایک کھچڑی سا بنا دیا جائے۔ہم نے ہر سال صرف ایک مضمون پر اپنی تمام تر توجہ دی اور اس میں وہ کامیابی حاصل کی کہ باید و شاید۔باقی دو مضمون ہم نے نہیں دیکھے لیکن ہم نے یہ تو ثابت کردیا کہ جس مضمون میں چاہیں پاس ہوسکتے ہیں۔

اب تک تو دو دو مضمونوں میں فیل ہوتے رہے تھے لیکن اس کے بعد ہم نے تہیہ کرلیا کہ جہاں تک ہوسکا اپنے مطالعے کو وسیع کریں گے۔یونیورسٹی کے بیہودہ اور بے معنی قواعد کو اپنی مرضی کے مطابق نہیں بناسکتے تو اپنی طبعیت پر ہی کچھ زور ڈالیں۔لیکن جتنا غور کیا اس نتیجے پر پہنچے کہ تین مضمونوں میں بیک وقت پاس ہونا فی الحال مشکل ہے۔پہلے دو میں پاس ہونے کی کوشش کرنی چاہئے۔چنانچہ ہم پہلے سال انگریزی اور فارسی میں پاس ہوگئے۔ اور دوسرے سال فارسی اور تاریخ میں۔

جن جن مضامین میں ہم جیسے جیسے فیل ہوئے وہ اس نقشے سے ظاہر ہیں:

گویا جن جن طریقوں سے ہم دو دو مضامین میں فیل ہوسکتے تھے وہ ہم نے سب پورے کردئے۔اس کے بعد ہمارے لیے دو مضامین میں فیل ہونا ناممکن ہوگیا۔اور ایک ایک مضمون میں فیل ہونے کی باری آئی۔

اتنی دفعہ امتحان دے چکنے کے بعد جب ہم نے اپنے نتیجوں کو یوں اپنے سامنے رکھ کر غور کیا تو ثابت ہوا کہ غم کی رات ہونے والی ہے۔ہم نے دیکھا کہ اب ہمارے فیل ہونے کا صرف ایک ہی طریقہ باقی رہ گیا ہے۔وہ یہ ہے کہ فارسی میں فیل ہوجائیں۔لیکن اس کے بعد تو پاس ہونا لازم ہے ہرچند کہ یہ سانحہ ازحد جانکاہ ہوگا۔لیکن اس میں یہ مصلحت تو ضرور مضمر ہے کہ اس سے ہمیں ایک قسم کا ٹیکا لگ جائے گا۔بس یہی ایک کسر باقی رہ گئی ہے۔اس سال فارسی میں فیل ہوں گے اور پھر اگلے سال قطعی پاس ہوجائیں گے۔چنانچہ ساتویں دفعہ امتحان دینے کے بعد ہم بیتابی سے فیل ہونے کا انتظار کرنے لگے۔یہ انتظار دراصل فیل ہونے کا انتظار نہ تھا بلکہ اس بات کا انتظار تھا کہ اس فیل ہونے کے بعد ہم اگلے سال ہمیشہ کے لیے بی۔اے ہوجائیں گے۔

ہر سال امتحان کے بعد جب گھر آتا تو والدین کو نتیجے کے لیے پہلے ہی سے تیار کردیتا۔رفتہ رفتہ نہیں بلکہ یکلخت اور فوراً،رفتہ رفتہ تیار کرنے سے خواہ مخواہ وقت ضائع ہوتا ہے۔اور پریشانی مفت میں طول کھینچتی ہے۔ہمارا قاعدہ یہ تھا کہ جاتے ہی کہہ دیا کرتے تھے کہ اس سال تو کم از کم پاس نہیں ہوسکتے،والدین کو اکثر یقین نہ آتا۔ایسے موقعوں پر طبعیت کو بڑی الجھن ہوتی ہے۔مجھے اچھی طرح معلوم ہے میں پرچوں میں کیا لکھ کر آیا ہوں۔اچھی طرح جانتا ہوں کہ ممتحن لوگ اگر نشے کی حالت میں پرچے نہ دیکھیں تو میرا پاس ہونا قطعاً ناممکن ہے۔چاہتا ہوں کہ میرے تمام بہی خواہوں کو بھی اس بات کا یقین ہوجائے تاکہ وقت پر انہیں صدمہ نہ ہو۔لیکن بہی خواہ ہیں کہ میری تمام تشریحات کو محض کسرِ نفسی سمجھتے ہیں۔آخری سالوں میں والد کو فوراً یقین آجایا کرتا تھا کیونکہ تجربہ سے ان پر ثابت ہوچکا تھا کہ میرا اندازہ غلط نہیں ہوتا،لیکن ادھر اُدھر کے لوگ ''اجی نہیں صاحب'' اجی کیا کہہ رہے ہو''۔ ''اجی یہ بھی کوئی بات ہے''۔ایسے فقروں سے ناک میں دم کردیتے۔بہر حال اب کے پھر گھر پہنچتے ہی ہم نے حسب دستور اپنے فیل ہونے کی پیشن گوئی کردی۔دل کو یہ تسلی تھی کہ بس یہ آخری دفعہ ہے۔اگلے سال ایسی پیش گوئی کرنے کی کوئی ضرورت نہ ہوگی۔ ساتھ ہی خیال آیا کہ وہ ہاسٹل کا قصہ پھر شروع کرنا چاہئے۔اب تو کالج میں صرف ایک ہی سال باقی رہ گیا ہے۔اب بھی ہاسٹل میں رہنا نصیب نہ ہوا تو عمر بھر گویا آزادی سے محروم رہے۔گھر سے نکلے تو ماموں کے ڈربے میں اور جب ماموں کے ڈربے سے نکلے تو شاید اپنا ایک ڈربا بنانا پڑے گا۔آزادی کا ایک سال صرف ایک سال اور یہ آخری موقعہ ہے۔

آخری درخواست کرنے سے پہلے میں نے تمام ضروری مصالحہ بڑی احتیاط سے جمع کیا،جن پروفیسروں سے مجھے اب ہم عمری کا فخر حاصل تھا،ان کے سامنے نہایت بے تکلفی سے اپنی آرزوؤں کا اظہار کیا اور ان سے والد کو خطوط لکھوائے کہ اگلے سال لڑکے کو ضرور آپ ہاسٹل میں بھیج دیں۔بعض کامیاب طلباء کے والدین سے بھی اس مضمون کی عرضداشتیں بھجوائیں۔خود اعداد و شمار سے ثابت کیا کہ یونیورسٹی سے جتنے لڑکے پاس ہوتے ہیں،ان

میں سے اکثر ہاسٹل میں رہتے ہیں، اور یونیورسٹی کا کوئی وظیفہ یا تمغہ یا انعام تو کبھی ہاسٹل سے باہر گیا ہی نہیں۔ میں حیران ہوں کہ یہ دلیل مجھے اس سے پیشتر کبھی کیوں نہ سوجھی تھی۔ کیونکہ یہ بہت کارگر ثابت ہوئی۔ والد کا انکار نرم ہوتے ہوتے غور غوص میں تبدیل ہو گیا، لیکن پھر بھی ان کے دل سے شک رفع نہ ہوا۔ کہنے لگے۔ ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جس لڑکے کو پڑھنے کا شوق ہو وہ ہاسٹل کی بجائے گھر پر کیوں نہیں پڑھ سکتا۔“

میں نے جواب دیا کہ ہاسٹل میں ایک علمی فضا ہوتی ہے، جو ارسطو اور افلاطون کے گھر کے سوا اور کسی کے گھر میں دستیاب نہیں ہو سکتی۔ ہاسٹل میں جسے دیکھو بحر علوم میں غوطہ زن نظر آتا ہے باوجود اس کے کہ ہر ہاسٹل میں دو دو تین تین سو لڑکے رہتے ہیں پھر بھی وہ خموشی طاری ہوتی ہے کہ قبرستان معلوم ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہر ایک اپنے اپنے کام میں لگا رہتا ہے۔ شام کے وقت ہاسٹل کے صحن میں جا بجا طلبا علمی مباحثوں میں مشغول نظر آتے ہیں۔ علی الصبح ہر ایک طالب علم کتاب ہاتھ میں لیے ہاسٹل کے چمن میں ٹہلتا نظر آتا ہے۔ کھانے کے کمرے میں، کامن روم میں، غسل خانوں میں، برآمدوں میں، ہر جگہ لوگ فلسفے اور ریاضی اور تاریخ کی باتیں کرتے ہیں، جن کو ادب انگریزی کا شوق ہے وہ دن رات آپس میں شیکسپیئر کی طرح گفتگو کرنے کی مشق کرتے ہیں۔ ریاضی کے طلباء اپنے ہر ایک خیال کو الجبرے میں ادا کرنے کی عادت ڈال لیتے ہیں۔ فارسی کے طلباء رباعیوں میں تبادلہ خیالات کرتے ہیں۔ تاریخ کے دلدادہ۔۔۔“

والد نے اجازت دے دی۔

اب ہمیں یہ انتظار کہ کب فیل ہوں، اور کب اگلے سال کے لیے عرضی بھیجیں۔ اس دوران میں ہم نے ان تمام دوستوں سے خط و کتابت کی جن کے متعلق یقین تھا کہ اگلے سال پھر ان کی رفاقت نصیب ہو گی اور انہیں یہ مژدہ سنایا کہ آئندہ سال ہمیشہ کے لیے کالج کی تاریخ میں یادگار رہے گا کیونکہ ہم تعلیمی زندگی کا ایک وسیع تجربہ اپنے ساتھ لیے ہاسٹل میں آ رہے ہیں جس سے ہم طلباء کی نئی پود کو مفت مستفید فرمائیں گے۔ اپنے ذہن میں ہم نے ہاسٹل میں اپنی حیثیت ایک مادر مہربان کی سی سوچ لی جس کے اردگرد نا تجربہ کار طلباء مرغی کے بچوں کی طرح بھاگتے پھریں گے۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب جو کسی زمانے میں ہمارے ہم جماعت رہ چکے تھے لکھ بھیجا کہ جب ہم ہاسٹل میں آئیں تو فلاں فلاں مراعات کی توقع آپ سے رکھیں گے، اور فلاں فلاں قواعد سے اپنے آپ کو مستثنیٰ سمجھیں گے۔ اطلاعاً عرض ہے۔

اور یہ سب کچھ کر چکنے کے بعد ہماری بدنصیبی دیکھئے کہ جب نتیجہ نکلا تو ہم پاس ہو گئے۔

ہم پہ تو جو ظلم ہوا سو ہوا، یونیورسٹی والوں کی حماقت ملاحظہ فرمایئے کہ ہمیں پاس کر کے اپنی آمدنی کا ایک مستقل ذریعہ ہاتھ سے گنوا بیٹھے۔

❁❁❁

شہر کا شہر مسلمان ہوا پھرتا ہے!!

مجھے کافر کہو گے تو تمہارا کیا بھلا ہو گا
روز محشر میرا بھی وہی خدا نکلا تو تیرا کیا ہو گا
کیسی بخشش کا یہ سامان ہوا پھرتا ہے
شہر سارا ہی پریشان ہوا پھرتا ہے!!
کیسا عاشق ہے تیرے نام پہ قرباں ہے مگر
تیری ہر بات سے انجان ہوا پھرتا ہے!!
جانے کب کون کسے مار دے کافر کہہ کے
شہر کا شہر مسلمان ہوا پھرتا ہے!!

❁❁❁

غزل

(طفیل عامر)

میں رہوں اجنبی، خیر ہو آپ کی
میرے دل کو لگی، خیر ہو آپ کی
آپ کے رخ پہ ہے پھول سی نازکی
اور ملے تازگی، خیر ہو آپ کی
یہ کبھی ایسا ہو ہم وہ مل کے کہیں
جو کہ ہے ان کہی، خیر ہو آپ کی
دیکھیں کب تک چلے، یا چلے نہ چلے
یہ جو ہے دوستی، خیر ہو آپ کی
قتل انسان ہوں ہاتھوں انسان کے
کیا رہی بندگی، خیر ہو آپ کی
حال دل ہم کہیں کیا یہ ممکن بھی ہے
ہر دفعہ ”پھر کبھی“ خیر ہو آپ کی
میرا اظہار ہے شعر کی شکل میں
کچھ کہیں آپ بھی، خیر ہو آپ کی

❁❁❁

مجازؔ... ایک گمشدہ حقیقت

تحریر: امجد اسلام امجد

اب تو دنیا بھر کے لٹریچر، لکھاریوں اور اُن کی تحریروں کے متن، تاریخ اور پس منظر تک رسائی آسان ہوگئی ہے اور یوں ماضی قریب یا بعید کے کسی لکھنے والے کو سمجھنے یا ادب میں اُس کی حیثیت کے تعین میں پہلی جیسی مشکلات حائل نہیں رہیں جب کہ کچھ عرصہ قبل تک یہ معاملہ بہت پیچیدہ اور اُلجھا ہوا تھا۔ کرکٹ کے کھلاڑیوں کی طرح لکھنے والوں کی بھی اک بھیڑ سی لگی ہوئی ہے جس میں مسلسل لمبی اننگز کھیلنے والوں کے ساتھ ساتھ ایسے لوگ بھی نظر آتے ہیں جن کا مختصر قیام بھی انھیں ایک ایسی زندگی دے جاتا ہے جو کئی بڑے بڑے سینئرز کو بھی حاصل نہیں ہوتی ایک دو اننگز یا صرف چند میچوں تک اُن کی موجودگی ایسے نقش چھوڑ جاتی ہے جو اپنی مثال آپ ہوتے ہیں یہ لوگ بعض اوقات انفرادی سطح پر ہی ظہور کرتے ہیں اور پھر جیسے یکدم گم سے ہوجاتے ہیں اور کچھ ایک گروہ، مکتبہ فکر، ہم عمری اور کم و بیش ایک جیسی شہرت کے باعث کسی نہ کسی انداز کے ایک گروپ کی شکل اختیار کر جاتے ہیں اس کی کسی خاص دور میں بے پناہ مقبولیت اور پھر اکثر کینسر میں جیتے جی موت بھی اپنی جگہ پر کسی معمّے سے کم نہیں ایسے ہی لوگوں کے بارے میں فارسی میں کہا جاتا ہے کہ

خوش درخشید و لے شعلہ مستعجل بُود

یعنی زیادہ دیر تو نہیں چمکا مگر جتنا بھی چمکا خوب چمکا اور اب تاریخ کا حصہ ہے۔ ان لوگوں کی کیمسٹری میں وہ کون سے عناصر ہیں جو بظاہر ایک دوسرے سے جغرافیائی، فکری، لسّانی یا نظریاتی دُوری کے باوجود بھی انھیں ایک لڑی میں پرو دیتی ہے۔

ادبِ عالم کی تاریخ میں ہر زبان میں اس طرح کے لوگ کم یا زیادہ مل جاتے ہیں مگر مجازؔ کے دور، ہم عصروں اور ادبی فضا کے بارے میں پڑھتے اور تحقیق کرتے ہوئے کچھ بہت عجیب وغریب اور اپنی نوعیت میں بے حد مختلف ایسی باتیں بھی سامنے آئیں جن میں سے کئی ایک کو اگر آپ ''حسنِ اتفاق'' کا درجہ بھی دیں تو بھی ان کی سحر انگیزی متاثر کیے بغیر نہیں دیتی مثال کے طور پر یہ کیسی عجیب بات ہے کہ بیسویں صدی کے پہلے پندرہ برسوں میں اُردو زبان میں چار ایسے لکھنے والے پیدا ہوئے جن میں بظاہر ہم عصر ہونے کے باوجود بھی براہ راست رابطہ نہ ہونے کے برابر تھا مگر یہ چاروں یعنی اختر شیرانی، میرا جی، منٹو اور مجازؔ ادب میں جلد اور غیر معمولی شہرت اور نوجوان نسل میں بے پناہ مقبولیت کے ساتھ ساتھ کئی اور معاملات میں بھی ایک مخصوص گروپ کا حصہ دکھائی دیتے ہیں چاروں میں سے کسی کو بھی عمر کی پانچ دہائیاں پوری کرنے کی مہلت نہیں ملی چاروں مے کش ہی نہیں مے خوار بلکہ رندِ بلا نوش تھے اور شراب نے اُن سب کی بے مثال ذہنی، جسمانی اور فطری صلاحیتوں کو منفی طور پر متاثر کرنے اور انھیں ڈی ٹریک کرنے میں کم و بیش ایک سا رول ادا کیا۔

چاروں نوجوان نسل کے محبوب اور ہیرو تھے اور اگرچہ اقبال اور فیض 1935 کے لگ بھگ ایک ساتھ اپنے ادوار کی موثر ترین آوازوں کے طور پر دیکھے جا رہے تھے اور اُن کے ہمراہ کچھ نئے اور پرانے لکھنے والوں کا ایک جمِ غفیر بھی آگے بڑھتا نظر آتا ہے جن میں سے کئی ایک آگے چل کر خود اپنے دور کے نمایندہ اور نگہدار کہلائے مگر اس کے باوجود اختر شیرانی، میرا جی، منٹو اور بالخصوص مجازؔ نے خواتین اور نوجوان نسل میں جو بے مثال مقبولیت حاصل کی وہ اُس وقت کے معاشرے اور لکھاریوں کے باہمی تعلق کی ایک ایسی تصویر ہے جو دوبارہ کبھی اس شکل میں نظر نہیں آتی اگرچہ بعد میں کچھ اور اہلِ قلم سمیت فیض، فراز اور پروین شاکر کو بھی نوجوان نسل میں بے انتہا مقبولیت حاصل ہوئی لیکن جس طرح سے ایک مختصر دورانیے میں ہی سہی مجازؔ نے اپنے عہد کی نئی نسل کو متاثر کیا اور پہلی بار ہمیں اردو کی ادبی فضا میں خواتین کی موجودگی کا بھرپور احساس دلایا اس کا کریڈٹ بلاشبہ مجازؔ ہی کو جاتا ہے انھیں کیوں اس قدر جلد (بلکہ اُن کی زندگی میں ہی) تقریباً فراموش کر دیا گیا۔

یہ اپنی جگہ پر کسی سربستہ راز سے کم نہیں کہ مجازؔ کی زندگی کام، مقبولیت اور آخری عمر کی بے معنویت پر جن بڑے بڑے اور اُس سے قریب تر لوگوں نے لکھا ہے اُس کی مدد سے بھی کچھ وثوق سے پتہ نہیں چلتا کہ آخر ہوا کیا تھا کہ ایک شاعر جو طالب علمی کے زمانے میں اپنی نسل کی Heart beat کی شکل اختیار کر گیا تھا اور جس کے اشعار علی گڑھ یونیورسٹی کے لڑکیوں کے ہاسٹلز اور ڈائریوں کے ساتھ ساتھ پورے برصغیر کے اردو ادب سے متعلق نوجوانوں کے دلوں میں گونجا کرتے تھے آخر ایسا کیا ہوا کہ اس کے قلم کی تاثیر دیکھتے دیکھتے بے رنگ ہوگئی اور خود اُس کی کسی جگہ پر موجودگی واقعے سے زیادہ ایک سانحے کی شکل اختیار کر گئی لیکن اس عجیب وغریب منظر نامے پر ایک نظر ڈالنے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس دور کے عالمی پسِ منظر میں اس غلام لیکن خواب دیکھنے والے برصغیر کی عمومی نفسیات، تعلیم، ادب سے تعلق اور بین الاقوامی سطح پر اُٹھنے والے نو بہ نو طوفانوں پر بھی ایک نظر ڈالی جائے کہ بیسیوں صدی کے یہ پہلے چالیس برس ہی تھے جن کی وجہ سے نہ صرف دنیا کا بلکہ برصغیر کا نقشہ بھی بدلا اور یہاں کے لوگوں کو پہلی بار زندگی اور اُس کے مختلف نظریات کے بارے میں یورپ (بلکہ انگلستان) کے علاوہ بھی ایسے لوگوں کی فکر اور سوچ سے آگاہی ہوئی جن کی وجہ سے دنیا نہ صرف دو عظیم جنگوں کی طرف تیزی سے بڑھ رہی تھی بلکہ جس کے فوری اور دیرپا اثرات کی وجہ سے انسانی تاریخ ایک ایسے دور میں داخل ہوئی جو اس سے پہلے فلسفے اور نظریات کی حد تک محدود تھا ایک طرف ترکی کی خلافتِ عثمانیہ (جس کا براہ راست تعلق یورپ کے بعض علاقوں سے صدیوں پر محیط تھا) پارہ پارہ ہوئی اور دوسری طرف بالفور ڈیکلریشن کے ذریعے اسرائیل کو ایک خواب سے حقیقت بنانے کا وہ سلسلہ آغاز ہوا جس کی وجہ سے آگے چل کر دنیا ہتھیاروں کے بجائے سرمائے کی تقسیم کی جنگ میں مبتلا ہوگئی۔ ہیگل اور کارل مارکس کی تعلیمات کے زیر اثر سرمایہ دارانہ نظام کے بالکل مخالف ایک نیا نظام کمیونزم یا سوشلزم کی شکل میں سامنے لایا گیا جس کے زیر اثر جہاں پوری دنیا بدلی وہاں برصغیر میں کانگریس اور مسلم لیگ کے علاوہ بھی غیر ملکی سامراج کے خلاف اور قومی آزادی کے حق میں سوچ سر بلند ہوئی اس نئی سوچ کو جوشؔ کی انقلابی شاعری سے قطع نظر سب سے زیادہ سہارا ترقی پسند تحریک نے دیا مگر غور سے دیکھا جائے تو مجازؔ اور اس کی شاعری کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے ہمیں 1930 کی دہائی کے ہندوستان کو سمجھنا ہوگا اور اس سفر کے لیے ہمیں قدم قدم پر مجازؔ کی ضرورت پڑے گی۔